دنیا بھر کے محنت کشو ایک ہو جاؤ!

پاکستان تناظر

2024-25ء

دستاویز نمبر 1

41 ویں کانگریس 2024ء

(1) عالمی جنگوں کی وسیع تباہ کاریوں اور خونریزیوں کے ذریعے خود کو وقتی طور پر بحال کرنے والی سامراجی سرمایہ داری 1970ء کی دہائی کے بعد سے ایک عمومی زوال کا شکار ہے۔ اس دوران شرح منافع میں اضافے کی نیولبرل کوششوں نے نئے تضادات کو جنم دیا جو کئی دہائیوں تک مجتمع ہوتے رہے اور بالآخر 2008ء میں ایک نئے بحران کی صورت میں پھٹ پڑے۔ جس کے بعد سے دوسری عالمی جنگ کے نتیجے میں تشکیل پانے والا عالمی لبرل آرڈر ہر حوالے سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔

(2) عالمی سرمایہ داری کی اس بحرانی کیفیت نے پاکستان جیسی تاخیر زدہ اور پسماندہ ریاستوں کے معاشی اور اقتصادی بحران کو کہیں زیادہ گہرا کر دیا ہے جس سے سیاسی اور سماجی گراوٹ نئی انتہاؤں کو چھو رہی ہے۔

(3) پاکستانی ریاست آج تاریخی اور ہمہ جہت بحرانوں میں گھری ہوئی ہے۔ یہ اس کے رجعتی جنم سے لے کر آج تک مجتمع ہونے والے تضادات کا ایک معیاری اور منطقی اظہار ہے۔

(4) گزشتہ تین دہائیوں میں ادھورے سماجی اور تکنیکی ارتقا کی بدولت جنم لینے والی نئی اشکال اور پیچیدگیوں نے ریاست کی سماج پر گرفت کو مزید کمزور اور لاغر کر دیا ہے۔ بورژوا حوالے سے یہاں ریاستی تشکیل ایک صحتمند یا کلاسیکی تاریخی پراسیس کے ذریعے نہیں ہوئی تھی۔ ایسے میں نئی سماجی اشکال یا معاشی کیفیات سے ریاست کو ہم آہنگ کرنے کی کوششوں نے نئے تضادات کو جنم دیا ہے۔

(5) پاکستانی ریاست مغرب میں انقلابات کے ذریعے تشکیل پانے والی جدید سرمایہ دارانہ ریاستوں سے مختلف ہے۔ یہ سامراج کی جانب سے ہندوستان کے بٹوارے جیسے انتہائی رجعتی اور ردانقلابی اقدام کی پیداوار ہے اور اپنے جنم سے ایک تاخیر زدگی و متروکیت کا شکار تھی۔ اسی وجہ سے اس کا کردار، ہیئت اور طریقہ ہائے کار بہت الگ ہیں۔ بلکہ بیشتر صورتوں میں کلاسیکی سرمایہ داری سے متضاد ہیں۔

(6) قومی بورژوازی کی کمزوری و نااہلی سمیت مختلف تاریخی وجوہات کی بنیاد پر فوج کا کردار اس ریاست کے جنم سے ہی غالب اور فیصلہ کن رہا ہے۔ جیسے ایک فرانسیسی سیاستدان نے سترہویں صدی میں پروشیا کی ریاست بارے کہا تھا کہ یہ وہ ملک نہیں جس کے پاس ایک فوج ہے بلکہ یہ ایک فوج ہے جس کے پاس ایک ملک ہے۔

(7) اس سلسلے میں دوسری عالمی جنگ کے بعد سابقہ نوآبادیاتی خطوں میں بننے والی زیادہ تر ریاستوں کا سرمایہ داری کے ایک مخصوص تاریخی عہد میں ظہور پذیر ہونا ایک اہم عنصر ہے۔ زیادہ تر صورتوں میں یہ نام نہاد آزادیاں مقامی بورژوازی کی جانب سے سامراج سے ایک مصالحت اور کاسہ لیسی کی بنیاد پر حاصل کی گئی تھیں۔ یوں یہ ریاستیں اور ان کے حکمران طبقات عالمی سرمایہ دارانہ نظام میں ایک جعلی اور مصنوعی پیوندکاری پر مبنی تھے جو سامراجی ریاستوں نے اپنے مفادات کے تحت کی تھی۔ جس نے ان ریاستوں کو روزِ اول سے ایک رجعتی اور جابرانہ کردار کا حامل بنا دیا اور ان سماجوں کو مزید پراگندہ اور بدنما کر دیا۔

(8) ایسے میں پچھلی ساڑھے سات دہائیوں میں یہاں کوئی صحتمند پارلیمانی جمہوریت پروان نہیں چڑھ پائی ہے، ریاستی جبر بڑھا ہے اور ریاست پر فوج کے غلبے، گرفت اور اثر و رسوخ میں کمی کی بجائے اضافہ ہی ہوا ہے۔ اس میں سرمایہ دارانہ نظام کی عالمی و ملکی سطح پر اپنی زوال پذیری اور بورژوازی کی تاریخی نااہلی اور خصی پن بنیادی محرکات ہیں۔ آخری تجزیئے میں یہ پاکستانی سرمایہ داری کی مصنوعیت اور بہت تاخیر سے عالمی منظرنامے پر نمودار ہونے کے ہی مضمرات ہیں۔

(9) یہاں کا حکمران طبقہ جاگیرداری کی باقیات کے خاتمے، معقول صنعتی و سماجی ڈھانچے کی استواری، جمہوری اور سیکولر ریاست کی تشکیل اور قومی مسئلے کے منصفانہ حل جیسے جدید قومی ریاست کے بنیادی فرائض ادا نہیں کر سکا۔ یوں وقت گزرنے کے ساتھ اس نااہلی کے نتیجے میں جنم لینے والے مسائل میں نہ صرف شدت آتی گئی بلکہ وہ پہلے سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہوتے گئے۔ اس سارے بحران کے سماجی، ثقافتی یا معاشرتی مضمرات سے نبرد آزما ہونے میں بھی یہ ریاست ناکام

رہی۔ بلکہ ایسے میں اپنی گرفت، رِٹ اور اتھارٹی کو قائم رکھنے کے لئے زیادہ رجعتی، جابر اور بے رحم ہوگئی۔

(10) معاشرے کی ترقی اور استحکام میں ناکام اس ریاست کے ادارے بشمول فوج، پولیس اور عدلیہ عملی طور پر اینگلز کے بقول ''قرونِ وسطیٰ کے مسلح جتھے'' بن کے رہ گئے۔ جہاں قانون کی حکمرانی، انصاف، جمہوریت اور سماجی مساوات جیسی اقدار بالکل پامال ہوگئیں اور عوام کے لئے یہ اصطلاحات کھوکھلی لفاظی سے زیادہ کچھ نہیں رہیں۔

(11) یوں پاکستانی ریاست کو وہ حاصلات میسر نہیں تھیں جنہیں ترقی یافتہ سرمایہ دارانہ سماجوں میں حکمران طبقات اپنے اقتدار اور استحصال کا جواز بناتے ہیں۔ نتیجتاً اسے کہیں زیادہ ننگے جبر پر اترنا پڑا۔

(12) 1970ء کی دہائی کے اواخر کے مخصوص ملکی و علاقائی حالات میں یہاں ریاستی سرپرستی میں مذہبی بنیاد پرستی کو بڑے پیمانے پر فروغ دینے کی پالیسی پر کام شروع ہوا۔ جس کے لئے پھر کالے دھن کی مالیاتی بنیادیں فراہم کرنے والے منظم نیٹورک بھی تشکیل دیئے گئے۔ افغان ثور انقلاب کو کچلنے کے لئے امریکی سامراج نے ضیاالحق کے ردِ انقلاب کو پوری حمایت اور معاونت دی۔

(13) لیکن اس عمل سے بالخصوص ریاست کے اندر موجود ریاست یا 'ڈیپ سٹیٹ' سے جڑے اداروں میں بدعنوانی کی سوچ اور کلچر گھر کرتے گئے۔ جس سے ان کی پیشہ وارانہ صلاحیتیں بری طرح متاثر ہوئیں اور وہ داخلی انتشار کا شکار ہو کے مختلف مفادات کے حامل گروہوں اور دھڑوں میں تقسیم ہوتے گئے۔ جن کے ٹکراؤ سے پھر حکمران سیاست بھی ایک ایسے انتشار کا شکار ہوئی جو آج اپنی انتہاؤں کو چھو رہا ہے۔

(14) یہ اس سارے عمل کا ہی منطقی نتیجہ ہے کہ کالے دھن اور بدعنوانی نے ریاستی اداروں کو اندر سے بری طرح زنگ آلود کر دیا ہے۔ سکیورٹی ادارے اوپر سے نیچے تک بارڈر اسمگلنگ میں

ملوث ہیں اور عسکری اشرافیہ میں زمینوں اور پلاٹوں کی دوڑ لگی ہوئی ہے۔ جس کے ساتھ پھر فوجی ہاؤسنگ سکیموں کا پورا سلسلہ جڑا ہوا ہے۔ ایران بلوچستان اور طورخم کے بارڈروں پر اربوں روپوں کی اسمگلنگ روزانہ ہوتی ہے۔ جس میں عسکری وسول انتظامیہ اور اسمگلروں کے مضبوط نیٹورک سرگرم ہیں۔ اداروں کی مختلف پرتوں میں کرپشن اور کمیشن کا یہ پیسہ تقسیم ہوتا ہے۔ جو پھر ہُنڈی کے ذریعے باہر منتقل ہوتا ہے جہاں بڑے افسران ریٹائرمنٹ کی پرتعیش زندگی گزارتے ہیں۔

(15) یہ بدعنوانی صرف مذکورہ بالا اداروں اور ذرائع تک محدود نہیں ہے بلکہ عدلیہ، پولیس اور سول بیوروکریسی سمیت ہر سرکاری دفتر اور ادارے میں سرایت کر چکی ہے۔ سیاسی اشرافیہ کی اس لوٹ مار میں حصہ داری الگ سے ہے۔ لیکن یہ کالا دھن ریاست کے اداروں کو نہ صرف کھوکھلا کر دیتا ہے بلکہ انہیں مزید رجعتی اور جابر بھی بنا دیتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ سب ریاستی مشینری کے خود اپنے نظام پر اعتماد کھو دینے کی بھی غمازی کرتا ہے۔

(16) غیر قانونی ذرائع سے جمع کیے گئے اس پیسے کو پھر ایجنٹوں اور فرنٹ مینوں کے ذریعے مختلف جگہوں پر لگا کے اس میں مزید اضافہ کیا جاتا ہے۔ جس میں رئیل سٹیٹ کا کاروبار سرفہرست ہے۔ مگر اس دولت کا ہجم اتنا وسیع ہوتا ہے کہ اسے سیاہ سے سفید میں تبدیل کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس رقم کو بیرون ملک منتقل کر کے جائیدادوں اور کاروباروں میں سرمایہ کاری کی جاتی ہے۔ لیکن شدید بحران کی کیفیت میں ریاست کو مکمل انہدام سے بچانے یا معیشت کو سہارا دینے کے لئے ایسی بے نامی جائیدادوں اور دوسری غیر قانونی سرگرمیوں پر ریاستی کریک ڈاؤن کی کوششیں بھی نظر آتی ہیں۔

(17) بڑے سرمایہ داروں اور کاروباریوں کو 'سہولیات' مہیا کرنے کے بدلے کروڑوں روپے کے کمیشن، رشوتیں اور کک بیکس بھی حاصل کیے جاتے ہیں۔ پچھلے عرصے میں مختلف وزرا، سیکرٹریوں اور دوسرے ریاستی افسران کے گھروں میں چھپائے اربوں روپے چھاپوں کے ذریعے برآمد کرنے کے واقعات سامنے آ چکے ہیں۔ جس سے بدعنوانی کی وسعت اور ہجم کا اندازہ لگایا جا

سکتا ہے۔

(18) اس کے علاوہ جرائم پیشہ افراد کے پاس منشیات، بھتہ خوری اور دوسرے مجرمانہ طریقوں سے جمع کیا گیا کالا دھن ہوتا ہے جس میں سے ظاہر ہے قانون نافذ کرنے والے اداروں کو حصہ جاتا ہے۔ جبکہ تاجر اور صنعتی سرمایہ دار سرکاری حکام کی مدد سے ٹیکس چوری، بجلی چوری وغیرہ کے ذریعے دولت کے انبار لگاتے ہیں۔

(19) یہاں کا سرمایہ دار تاریخی طور پر ان چوریوں اور ناجائز طریقوں کے بغیر وہ شرح منافع حاصل کرنے سے قاصر ہے جس سے وہ اپنے کاروباری وجود کو برقرار رکھ سکے۔ یہ اس بورژوازی کی کمزور تکنیکی اور مالیاتی بنیادوں کا ایک مظہر ہے۔

(20) ریاست، سیاست اور سرمایہ داروں کی مختلف پرتوں کی جانب سے جمع کیے گئے اس کالے دھن کا ایک حصہ رئیل سٹیٹ، تعمیرات اور سٹاک مارکیٹ وغیرہ جیسی قانونی معاشی سرگرمیوں میں انویسٹ کیا جاتا ہے تو ہمیں کسی حد تک معاشی گروتھ نظر آتی ہے۔ اسی طرح ڈالر اور سونے میں بھی سرمایہ کاری کی جاتی ہے۔ لیکن یہ پیسہ زیادہ تر ایسے نسبتاً غیر پیداواری شعبوں میں ہی جاتا ہے جہاں کم سے کم وقت میں زیادہ ریٹرن مل سکتا ہے۔ یوں اس معاشی گروتھ کا کردار عارضی اور کھوکھلا ہی رہتا ہے۔ علاوہ ازیں معاشی بحران میں اضافہ بدعنوانی کی اس دوڑ کو تیز ہی کرتا ہے جس سے ریاستی آمدنی کے ذرائع اور اس کے ڈھانچے مزید کھوکھلے ہوتے جاتے ہیں۔

(21) یہ پیسہ اور لوٹ مار ان قانونی کاروباری ذرائع کے علاوہ ہے جو سول و فوجی کمرشل اداروں کے سربراہان یا کلیدی عہدیداروں کے طور پر یہ ریاستی اشرافیہ کماتی ہے۔ آج نہ صرف فوج بلکہ حکومت کے تحت چلنے والے بیشتر سرکاری اداروں پر فوجی افسران براجمان ہیں۔ سیاہ و سفید سرمائے کی اس سرایت نے ادارے کے ڈسپلن اور پیشہ وارانہ سوچ کو تہس نہس کر کے رکھ دیا ہے۔

(22) معیشت میں اپنی دیوہیکل انٹرپرائزز کے ذریعے فوج کی گہری مداخلت کے نتیجے میں اس کی دوسرے ریاستی اداروں، سیاست اور ثقافت سمیت ہر سماجی شعبے میں مداخلت یا سرایت

ناگزیر ہے۔ یہ ایک بار پھر اپنی معاشی اور سیاسی بالادستی قائم رکھنے میں یہاں کے حکمران طبقے یا بورژوازی کی ناکامی ہے۔

(23) ملٹری ہارڈ ویئر کی مختلف ممالک سے خرید و فروخت میں بھی اربوں روپوں کے کمیشن اور کک بیکس وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔ یہ دولت کمانے کا ایک اور بہت بڑا اور محفوظ ذریعہ ہے جس کی سول حکومت کی طرف سے پوچھ گچھ کا کوئی میکانزم نہیں ہے۔ نہ ہی کوئی حکومت ایسی جرات کر سکتی ہے۔ ایسے مختلف سودوں میں 5 سے 8 فیصد تک کمیشن ایک کھلا راز ہے۔ جو پھر مختلف سطحوں پر تقسیم ہوتا ہے۔

(24) جائز و ناجائز پیسے کی اس دوڑ کی وجہ سے ڈیپ سٹیٹ کے اندر شدید تقسیم اور دھڑے بندی نے جنم لیا ہے۔ جو مختلف مواقع پر مختلف شکلوں میں اپنا اظہار کرتی رہتی ہے۔ اس کا اظہار جہادی اور بنیاد پرست گروہوں کی طرف اپنائی جانے والی متضاد پالیسیوں کی شکل میں بھی ہوتا ہے۔ کیونکہ ڈیپ سٹیٹ کا ایک طاقتور حصہ ان گروہوں کے ساتھ گہرے سیاسی و مالیاتی بندھنوں میں جڑا ہوا ہے۔ اسی طرح عمران خان سمیت اپنی مرضی کے وزرائے اعظم لانے اور حکومتی سیٹ اپ بنانے کے عمل میں بھی یہ گروہ بندی واضح نظر آتی ہے۔ جس سے شدید سیاسی عدم استحکام کی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کیفیات میں بالخصوص پچھلی ایک ڈیڑھ دہائی میں شدت آئی ہے۔

(25) ریاستی و سیاسی دھڑے بندیوں کی یہ سازشیں اور تصادم بعض اوقات بہت آگے بھی بڑھ بھی جاتے ہیں۔ باجوہ فیض عمران گٹھ جوڑ اور 2018ء میں عمران خان حکومت کی تشکیل ایسی ہی ایک صورت تھی۔ جس میں ایک طویل المدتی اقتدار کی منصوبہ بندی شامل تھی۔ لوٹ مار اور طاقت کے حصول پر مبنی گروہ بندیوں کا مگر المیہ ہوتا ہے کہ وہ جلد ٹوٹ پھوٹ کا شکار بھی ہو جاتی ہیں جن کا انجام پھر ایک طرح کی گینگ وار پر ہوتا ہے۔

(26) لیکن اپنے حاوی سیاسی و مالیاتی کردار کے باوجود فوج بہر حال ریاست کا ایک حصہ ہے اور کبھی حکمران طبقے کی جگہ نہیں لے سکتی۔ یوں یہ ادارے بادشاہ سے زیادہ 'بادشاہ گر' ہیں۔

کیونکہ ریاست کو بہر حال حکمران طبقہ اور اس کی سیاسی شکلیں درکار ہوتی ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ مخصوص حالات میں فوج کا براہ راست اقتدار کچھ طوالت اختیار کر جائے۔ مگر وہ آخری تجزیئے میں بورژوازی کے مفادات کی ہی نگہبان ہوتی ہے۔ چیمبر آف کامرس کی آرمی چیف کے ساتھ حالیہ ملاقاتیں اس حقیقت کا اظہار ہیں۔

(27) یہ بھی حقیقت ہے کہ ریاست، سیاست اور حکمران طبقات کے دھڑے ایک دوسرے سے جتنے بھی متصادم ہوں، نظام کے وجود کو لاحق خطرات کے سامنے اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ ان کی دوستیاں اور دشمنیاں مستقل نہیں ہوتیں۔ صرف سرمائے کے نظام کا تحفظ مستقل نصب العین ہوتا ہے۔ اسی لئے جب ان کی آپسی لڑائیوں سے عدم استحکام حد سے بڑھنے لگتا ہے تو یہ کمپرومائز کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کچھ مزاحمت کے بعد اپنی شکست واضح دیکھ کے ایک گروہ یا اس کے بیشتر حصے 'رضا کارانہ' پسپائی اختیار کر لیتے ہیں۔ ان حالات میں اقتدار نسبتاً پرامن طور سے ایک دھڑے سے دوسرے کو منتقل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن ضروری نہیں کہ مفاہمت یا کمپرومائز ہمیشہ ممکن ہو پائے۔ ایسے میں یہ تصادم پھر زیادہ دھماکہ خیز شکلیں اختیار کر سکتے ہیں جو خانہ جنگی کی نہج تک بھی جا سکتی ہیں۔ ملک میں وقتاً فوقتاً آنے والی دہشت گردی کی لہروں میں ان عوامل کا بھی کردار رہا ہے۔

(28) اسی طرح محنت کش طبقے کے تحریکوں کے سامنے یہ متصادم حکمران دھڑے فوراً متحد ہو جاتے ہیں۔ چاہے ان کے آپس میں کتنے بھی تضادات ہوں۔ انقلابی حالات میں یہ اپنے اختلافات کو بعد میں حل کرنے کے لئے ایک طرف رکھ چھوڑتے ہیں۔

(29) لیکن حالیہ سالوں میں پاکستانی ریاست کے بحران نے کلیدی اداروں کو پہلی مرتبہ عام لوگوں کے سامنے اس حد تک بے نقاب کیا ہے کہ ان میں دھڑے بندی واضح طور پر آشکار ہوئی ہے اور عوام میں موضوع بحث بنی ہے۔ یہ بنیادی طور پر اس بحران کی شدت کا اظہار ہے۔

(30) ہر ریاست اپنے جبر یا رِٹ کو مختلف فریبوں میں لپیٹ کر پیش کرتی ہے۔ جس میں

حب الوطنی، قوم پرستی اور مذہبی تقدیس جیسے جذبات شامل ہوتے ہیں۔ ان کو نصابوں، لٹریچر، منبر اور میڈیا وغیرہ کے ذریعے بڑھایا اور ابھارا جاتا ہے۔

(31) دراصل ریاست کو ایک بالکل فطری اور ناگزیر قوت کے طور پر اس طرح سے لوگوں کی سوچوں اور نفسیات میں شامل کیا جاتا ہے کہ اس کے وجود کا احساس ہی نہ ہو پائے۔ اس سارے عمل میں بالخصوص فوج اور عدلیہ جیسے ریاستی اداروں کی انتہائی گہری عقیدت کا جذبہ عوام میں ابھارا جاتا ہے۔ انہیں اس حد تک نیوٹرل اور منصفانہ بنا کے پیش کیا جاتا ہے کہ ریاست سے ماورا نظر آئیں اور کسی طبقاتی تصادم میں محنت کش حتمی ''مصالحت کار'' کے طور پر ان کا یقین کر لیں۔

(32) لیکن پاکستانی سرمایہ داری کا ہمہ جہت بحران اس سارے تقدس اور اعتماد کو بہت کمزور کرنے کا باعث بنا ہے جو ریاست کے سنجیدہ پالیسی سازوں کے لئے ایک تشویشناک امر ہے۔ ایسے میں قاضی فائز عیسیٰ کو لانا، عدالتی کاروائیوں کو براہِ راست نشر کرنا اور بھٹو کا کیس دوبارہ کھولنا وغیرہ بنیادی طور پر عدلیہ کی ساکھ کو بحال کرنے کی کوششیں ہیں۔ لیکن بحران اتنا گہرا ہے کہ یہ کوششیں بھی جلد ہی کھٹائی میں پڑ جاتی ہیں۔ مثلاً 'پراجیکٹ عمران خان' کو رول بیک کرنے کے عمل میں سپریم کورٹ کے کچھ ججوں کو استعفوں کے ذریعے جس طرح بھگایا گیا اس سے ان منصفوں کی خودمختاری، خودداری اور حمیت کا پردہ بھی چاک ہو گیا ہے۔

(33) موجودہ چیف جسٹس قاضی فائز عیسیٰ اپنے کچھ سابقہ بے باک فیصلوں کی وجہ سے اصلاح پسند حلقوں کے پسندیدہ شخص کے طور پر سامنے آیا تھا۔ مگر آخر کار وہ اسی ریاست کا ہی نمائندہ ہے اور اب سیاسی فیصلے دینے پہ مجبور ہو رہا ہے۔ افتخار چوہدری کی طرح اس منصف کی قلعی بھی جلد ہی مکمل کھل جائے گی۔ لیکن اب بھی عدلیہ کی تعظیم اور وقار بحال کرنے کی کوششیں اپنے الٹ نتائج ہی دے رہی ہیں۔

(34) عدالتوں کی جانب سے متضاد و متصادم فیصلے آنا ایک معمول بن چکا ہے۔ اسی طرح ججوں کی پارٹی وابستگیاں، جو پہلے کبھی ڈھکی چھپی ہوتی تھیں، آج عام ہو چکی ہیں۔ ایک طرف

لاکھوں مقدمات زیرالتوا ہیں جن میں لوگوں کی زندگیاں گزر جاتی ہیں۔ دوسری طرف اعلیٰ عدلیہ کی تمام تر توجہ سیاسی و ریاستی نوراکشتی اور حکومتی امور میں مداخلت پر مبذول نظر آتی ہے۔ یہ صورتحال عام لوگوں میں شدید غم و غصے کا باعث بنی ہے۔ حالیہ سالوں میں عدالتی لڑائیوں اور ججوں کے یکطرفہ فیصلوں نے عدالتی وقار اور غیر جانبداری کے تاثر کی دھجیاں اڑا دی ہیں۔

(35) نچلی عدالتوں میں بھی کھلی کرپشن اور ناانصافیوں اور پیسے کی دھونس نے عوام کو انصاف کے ان خستہ حال مندروں سے بیگانہ کر دیا ہے۔ بے گناہ ہونے کے باوجود کچہری کا نام ہی لوگوں کے لئے خوف کی علامت بن چکا ہے۔ عوام جتنے ذلیل ورسوا کچہریوں اور عدالتوں میں ہوتے ہیں اتنے شاید کہیں اور نہیں ہوتے۔

(36) ان حالات میں ریاست کے ان کلیدی ترین اداروں پر وسیع تر عوام کا اعتماد بہت کمزور ہو چکا ہے۔ اس کا واضح اظہار یوں بھی ہوا ہے کہ اقتدار سے بے دخلی کے بعد ان اداروں پر عمران خان کی تنقید اس کی مقبولیت میں اضافے کا باعث بنی ہے۔ اگرچہ اس کے پیچھے اور بھی کئی وجوہات کارفرما ہیں۔

(37) لیکن یہ ایک عمومی صورتحال بن چکی ہے کہ ریاستی اداروں پر تنقید کرنے والا ہر سیاسی رجحان مقبولیت حاصل کرتا ہے۔ ہر طرح کے سماجی و سیاسی فرق کے باوجود نواز شریف کے ''ووٹ کو عزت دو'' کے نعرے سے لے کر پی ٹی ایم کی تحریک اور پھر تحریک انصاف قیادت کی حالیہ واشگاف ایجی ٹیشن تک ہمیں یہ کیفیت نظر آتی ہے۔ بالخصوص پی ٹی ایم اور پی ٹی آئی کی طرف سے پاکستان کی تاریخ میں کبھی نہ سنی گئی تنقید نے فوج کے ادارے کی ساکھ پر گہری ضربیں لگائی ہیں۔ جس سے بحالی کے امکانات لمبے عرصے میں کم ہی نظر آتے ہیں۔

(38) بہرحال پی ٹی ایم سے ہٹ کر ہر مروجہ سیاسی پارٹی کی ریاست پر تنقید حکمران طبقات میں اقتدار کی کشمکش کا ہی نتیجہ ہے۔ ان کاسہ لیس سیاسی جماعتوں کی سرپرستی سے جب ہاتھ کھینچ لیا جاتا ہے تو یہ بڑی باغی اور جمہوریت پسند بن جاتی ہیں۔ لیکن اس شور شرابے میں بھی

ریاستی گماشتگی میں واپس لیے جانے کی تڑپ شامل ہوتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ پہلے ن لیگ اوراب پی ٹی آئی اقتدار سے بے دخلی کے بعد در پردہ فوج سے مذاکرات میں بھی مصروف رہے ہیں۔

(39) ریاست یا ڈیپ سٹیٹ کی طرف سے کچھ نرمی دوبارہ ان پارٹیوں کو انہی اداروں کے گن پہلے سے زیادہ گانے کے لئے بے چین کر دیتی ہے۔ن لیگ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔جنہوں نے ذلت آمیز طریقے سے انہیں اقتدار سے بے دخل کیا اور جیلوں سے لے کے لندن تک ذلیل ورسوا کیا انہی کے اشارے پر اس جماعت نے اپنی سیاسی تاریخ کے مشکل ترین سولہ مہینے کا اقتدار قبول کر کے ریاست کو سہارا دیا۔جس میں پھر پیپلز پارٹی نے بھی اپنا بھرپور 'جمہوری' حصہ ڈالا۔

(40) تاہم بلوچستان، سابقہ فاٹا اور سندھ میں چلنے والی مزاحمتی تحریکوں نے بھی ریاست کو جہاں بے بس کر دیا ہے وہاں اس کی کمزوری کو بھی عیاں کیا ہے۔لیکن اس سے ریاستی جبر اور تشدد میں بھی اَن دیکھا اضافہ ہو رہا ہے جس میں جبری گمشدیاں، فوجی آپریشن، جعلی پولیس مقابلے، ڈیتھ سکواڈ اور مسخ شدہ لاشیں شامل ہیں۔ یہ صورتحال یہاں قومی مسئلہ حل کرنے میں پاکستانی سرمایہ داری کی تاریخی ناکامی و نااہلی کا اظہار ہے۔

(41) پاکستانی سرمایہ داری کی موجودہ کیفیت میں محکوم خطوں کی مساوی بنیادوں پر دوررس ترقی، خوشحالی اور مراعات وغیرہ کے ذریعے قومی مسئلے کو حل کرنے یا کسی حد تک دبانے کے بارے میں یہ حکمران سوچ بھی نہیں سکتے۔نہ ہی ان خطوں میں ریاست بندوق کے زور پر اپنی مستقل اور ہمہ گیر عملداری قائم رکھ سکتی ہے۔ یہ ایک مسلسل سلگتا اور بڑھتا ہوا مستقل مسئلہ ہے جس نے ریاست کو زیادہ زہریلا کر دیا ہے۔

(42) ایسے میں ایک طویل عرصے سے ریاست بلوچستان کی قومی تحریک سے برسرپیکار ہے۔جس میں فوجی آپریشن اور مسلح تصادم بھی جاری ہیں مگر ریاست وہاں اپنی مکمل رِٹ قائم کرنے میں ناکام نظر آتی ہے۔حالیہ عرصے میں بلوچ علیحدگی پسندوں کے شدید حملے جن میں فوج

کو بھاری جانی نقصان اٹھانا پڑا جہاں ریاستی کمزوری کو ظاہر کرتا ہے وہاں بلوچستان میں جاری مسلح بغاوت کی جدید تکنیکی اور عسکری خطوط پر استواری کا اشارہ بھی دیتا ہے۔

(43) اسی طرح سابقہ فاٹا سے ابھرنے والی پشتون تحفظ موومنٹ بھی ریاست کے لئے گہرے دردِ سر کا باعث بنی ہے۔ لیکن یہ 'تذویراتی گہرائی' کی پالیسیوں کے تحت اس خطے کو مسلسل برباد اور تاراج کرنے کے ہی نتائج ہیں۔

(44) کشمیر میں بھی بجلی کے بلوں کی تحریک نے وہاں موجود معاشی ذلت اور قومی محرومی کے جذبات کو منظرِ عام پر لا کھڑا کیا ہے۔

(45) بیشتر صورتوں میں ان قوموں کے محنت کش عوام زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہے ہیں جنہیں دنیا کی کوئی ریاست شکست نہیں دے سکتی۔ لیکن یہ تحریکیں قوم پرستانہ بنیادوں پر نہ اپنے مسائل حل کروا سکتی ہیں نہ ہی دوسرے خطوں اور ملک کے وسیع عوام سے خود کو جوڑ سکتی ہیں۔ یہ درست ہے کہ پنجاب سمیت پورے پاکستان کے ترقی پسند اور انقلابی حلقوں کی طرف سے ان تحریکوں کو خاصی حمایت ملی ہے۔ لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ ان قومی تحریکوں کے سلگتے ہوئے ایشوز کو طبقاتی مسائل اور پروگرام سے جوڑ کر ملک گیر پیمانے پہ ایک انقلابی جہت دی جائے۔ اس کے بغیر ایک بند گلی میں ریاست سے مسلسل برسرِ پیکار ہونے کی صورتحال ہی موجود رہے گی۔

(46) افغانستان کی طرف پاکستانی ریاست کی پالیسی بھی ایک بحران کا شکار نظر آتی ہے۔ طالبان کے اقتدار پر قبضے اور پاکستان میں عمران خان حکومت کے خاتمے کے بعد فوجی قیادت کی افغان پالیسی میں ایک شفٹ نظر آتا ہے۔ جس میں ٹی ٹی پی کے مسئلے کا کلیدی کردار ہے۔ پاکستان میں ہونے والے حالیہ دہشتگردانہ حملوں کو اس گروہ نے تسلیم کیا ہے جبکہ طالبان حکومت نے ان کے خلاف کوئی کاروائی کرنے سے عملاً انکار ہی کیا ہے۔ جو پاکستان کو طالبان حکومت کے خلاف سخت سفارتی احتجاج کی سطح پر لے گیا ہے۔ جبکہ چین کے ذریعے بھی طالبان پر دباؤ ڈالنے کی کوششیں کی گئی ہیں۔

(47) حالیہ مذاکرات میں ٹی ٹی پی نے پاک افغان سرحدی علاقوں پر اپنا کنٹرول قائم کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔ نتیجے میں پاکستان نے اقوام متحدہ میں مراسلہ بھیجا ہے کہ طالبان حکومت کو تسلیم کرنے کا عمل ٹی ٹی پی کی پشت پناہی ختم کرنے سے مشروط کیا جائے۔ یہ ایک غیر معمولی پیش رفت ہے۔ کیونکہ پاکستان اس سے قبل عالمی سطح پر افغان طالبان حکومت کو تسلیم کروانے کے لئے سرگرم کردار ادا کرتا رہا ہے۔

(48) اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ طالبان پر پاکستانی ریاست کا ویسا اثر ورسوخ آج موجود نہیں ہے جیسا ماضی میں رہا ہے۔ یہ طالبان خود مختلف دھڑوں اور گروہوں پر مشتمل ہیں جن کی آپسی چپقلشیں اور خونریزیاں بھی ریکارڈ پر ہیں اور جن کے مختلف سامراجی طاقتوں کیساتھ تعلقات ہوسکتے ہیں۔ ان میں پاکستان نواز گروہ بھی شامل ہیں۔

(49) لیکن بحیثیت مجموعی وہ آج پہلے کی طرح اسلحے، پیسے اور تذویراتی سپورٹ کے لئے پاکستان پر منحصر نہیں ہیں جس کی وجوہات میں امریکہ کے یہاں سے چلے جانے کے ساتھ ساتھ چین کے ساتھ ان کی قربتیں اور افغانستان میں بڑی چینی سرمایہ کاری شامل ہے۔ ان حالات میں وہ ٹی ٹی پی جیسے گروہوں کو نہ صرف پاکستان بلکہ چین کے ساتھ بھی ایک 'بارگیننگ چپ' کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں طالبان ایسے خدشات کا بھی شکار ہو سکتے ہیں کہ ٹی ٹی پی کے خلاف کاروائی خود ان کے اندر ٹوٹ پھوٹ اور خانہ جنگی کا موجب بن سکتی ہے۔ لیکن پھر ٹی ٹی پی جیسے گروہوں یا ان کے کچھ حصوں کے پاکستانی ڈیپ سٹیٹ کے مختلف دھڑوں کے ساتھ تعلقات بھی 'اچھے' اور 'برے' طالبان کی درجہ بندی میں ایک عامل کے طور پر شامل رہے ہیں۔

(50) ریاست کے طاقتور حصوں کے مختلف جہادی گروہوں کے ساتھ تعلقات اور ان سے جنم لینے والی متضاد یا منافقانہ پالیسیاں بھی عام لوگوں کے سامنے بڑے پیمانے پر بے نقاب ہونے کی طرف گئی ہیں۔ پی ٹی ایم کے ابھار میں اس عمل کا کلیدی کردار رہا ہے۔ لیکن پھر اس تحریک کے ذریعے یہ حقائق سابقہ فاٹا اور پشتون علاقوں سے نکل کر پنجاب سمیت ملک کے دوسرے

خطوں کے عوام تک بڑے پیمانے پہ پہنچے ہیں۔اس لئے ریاستی حکام دہشت گردی کے واقعات کو جب 'دشمن ملک' پہ ڈال کے خود بری الذمہ ہونے کی کوشش کرتے ہیں تو انہیں شدید عوامی تنقید کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور لوگ سوال اٹھاتے ہیں۔

(51) اس حوالے سے سکیورٹی اداروں میں طبقاتی تقسیم بھی لوگوں کے سامنے کسی حد تک واضح ہونے کی طرف گئی ہے۔جس میں انہوں نے عام سپاہیوں یا جوانوں اور 'جرنیلوں' کے درمیان فرق کرنا سیکھا ہے۔لیکن اداروں میں طبقاتی بنیادوں پر تقسیم اور جبر واستحصال کا ادراک پھر سویلین آبادی سے کہیں زیادہ خود سپاہیوں کو ہوتا ہے۔جنہیں ہر روز نہ صرف طبقاتی تعصب اور تذلیل کا نشانہ بلکہ حکمران طبقات کی جنگوں کا ایندھن بھی بنایا جاتا ہے۔بہرحال عام حالات میں یہ شعور ایک نسبتاً مبہم اور ادھوری شکل میں موجود رہتا ہے لیکن طبقاتی جدوجہد کے فیصلہ کن لمحات میں نہ صرف عوام بلکہ فوجی جوانوں میں بھی بہت کامل، واضح اور ٹھوس شکل میں سامنے آتا ہے۔

(52) ان حالات میں پھر داعش جیسے طالبان مخالف گروہ بھی خطے میں سرگرم ہیں جو نہ صرف پاکستان میں دہشت گردی کرتے ہیں بلکہ افغانستان میں سویلین آبادی کے ساتھ ساتھ طالبان حکام کو نشانہ بنانے میں بھی مصروف ہیں۔ایک زمانے میں شام اور لیبیا وغیرہ کی طرح یہاں بھی انہیں امریکی سامراج کی پشت پناہی یا خاموش آشیرآباد حاصل ہونے کا تاثر موجود ہے۔

(53) یوں جہادی گروہوں کی دہشت گردی کا مظہر انتہائی پیچیدہ ہے جس میں کالے دھن کے مختلف ماخذ، علاقائی و عالمی سامراجی قوتیں، ان قوتوں کے اپنے اندر تقسیم اور بنتی بگڑتی تعلق داریاں شامل ہیں۔یہی وجہ ہے کہ دہشت گردی کے سلسلے کبھی بند ہو جاتے ہیں تو کبھی دوبارہ شروع بھی ہو جاتے ہیں۔فوجی آپریشن اس ناسور کی سماجی و مالیاتی بنیادوں کا خاتمہ نہیں کر سکتے۔ایسے میں آج نہ صرف اس خطے بلکہ دنیا بھر سے بنیاد پرستی اور دہشت گردی کا خاتمہ' سرمایہ داری کے انقلابی خاتمے سے مشروط ہو چکا ہے۔وگرنہ یہ سامراج کی پیدا کردہ وحشت مختلف شکلوں اور مختلف شدتوں کے ساتھ جاری وساری رہے گی۔بہرحال پاکستان کی مغربی سرحد کی سکیورٹی صورتحال

ایک بگاڑ کا شکار اور ملک میں مسلسل عدم استحکام کا ماخذ ہے۔

(54) اس کیفیت کا اظہار ایران کے ساتھ حالیہ کشیدگی میں بھی ہوا ہے جس میں ایران نے پہلے پاکستانی حدود میں مبینہ طور پر ایک بنیاد پرست گروہ کے ٹھکانوں پہ حملہ کیا۔ جس کے جواب میں پاکستان نے شدید سفارتی احتجاج بھی کیا اور ایران کی حدود میں مبینہ طور پر بلوچ عسکریت پسندوں کے ایک ٹھکانے پہ حملہ کیا۔ ان دونوں حملوں میں بچوں اور عورتوں کی ہلاکتیں بھی ہوئیں۔

(55) ایران نے ان دنوں اسرائیل کے سامنے اپنی بے بسی اور خجالت پر پردہ ڈالنے اور داخلی طور پر عوام پر ریاستی دھاک بٹھانے کے لئے ایسے ہی حملے شام اور عراق میں بھی کیے ہیں۔ لیکن اس صورتحال سے بلوچستان کے قومی مسئلے کی پیچیدگی بھی سامنے آتی ہے۔ جس میں یہ ریاستیں ایک دوسرے کی حدود میں مختلف مسلح گروہوں کو بطور پراکسی استعمال کر رہی ہیں۔

(56) امریکہ اور چین کے مفادات کا ٹکراؤ بھی ریاستی ڈھانچوں میں تناؤ اور مختلف حکومتوں کی متضاد پالیسیوں کا باعث ہے۔ یہاں امریکی سامراج کی اجارہ داری تو کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے لیکن ایک چینی لابی بھی مختلف شکلوں میں سرگرم نظر آتی ہے۔ جس کا سب سے نمایاں دانشور اور سیاسی آلہ کار مشاہد حسین بن کے ابھرا ہے۔ موصوف آج کل عالمی سطح پر چین نواز سوشلسٹ حلقوں میں بھی سرگرم ہیں۔

(57) آج کل امریکی سامراجی لابی سی پیک کا بوریا بستر گول کرنا چاہتی ہے جس کے لئے آئی ایم ایف کے ذریعے دباؤ ڈلوایا جاتا ہے۔ عمران خان کے دور میں وہ اس مقصد میں کافی حد تک کامیاب بھی رہے ہیں۔ لیکن پاکستانی بورژوازی کے ایک موٹے حصے اور فوج کے کمرشل اداروں کے ٹھیک ٹھاک منافعے چینی سرمایہ کاری سے وابستہ ہیں۔ ن لیگ بالخصوص سی پیک کی بڑی حامی اور علمبردار رہی ہے۔ لیکن اس سے ہٹ کے بھی چین کے ساتھ 'دوستی' عسکری اور تذویراتی حوالے سے پاکستانی ریاست کے لئے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ چین ان کو ٹھیک ٹھاک

قرضے بھی دے رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نئی فوجی قیادت کی جانب سے سی پیک کو بھرپور معاونت دینے کے بیانات بھی جاری کیے گئے ہیں۔

(58)(I) پاکستانی ریاست نے ایوب خان کے دور سے ہی چین کی طرف جھکاؤ کے ذریعے امریکی سامراج کو بلیک میل کرنے کی پالیسی اپنائی ہے۔ لیکن عالمی سرمایہ داری کے دریا میں امریکی مگرمچھ کے بغیر ان کا گزارہ بھی نہیں ہے۔ ان حالات میں انہیں دونوں قوتوں کے درمیان توازن قائم رکھ کے چلنا پڑتا ہے جس میں ظاہر ہے حاوی کردار امریکہ کا ہی ہوتا ہے۔ لیکن حالیہ سالوں میں چین کے عالمی سطح پر ابھار کی کیفیت میں ایک طرف طاقتوں کا توازن کسی قدر بدل رہا ہے۔ دوسری طرف چین امریکہ چپقلش بھی ایک نئی نہج پہ پہنچ رہی ہے جس کے اثرات آنے والے دنوں میں نہ صرف پاکستان بلکہ دنیا بھر میں محسوس کیے جائیں گے۔

(58)(II) پاکستان میں امریکی سفیر کی جانب سے گوادر کے دورے نے بھی بہت سی چہ مگوئیوں کو جنم دیا ہے۔ اس عمل سے جہاں امریکہ نے بلوچستان میں چینی مفادات کے مقابلے میں اپنی ''دلچسپی'' ظاہر کی ہے وہاں پاکستانی ریاست نے بھی قرضوں میں چھوٹ اور سرمایہ کاری کی شرائط میں نرمی وغیرہ کے لئے چین پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

(59) ریاست کے سول انتظامی ڈھانچے کی بات کریں تو دوسرے شعبوں کی طرح یہ بھی ابھی تک نوآبادیاتی بنیادوں پر ہی استوار ہے۔ کئی دہائیوں کی ان گنت تبدیلیوں کے باوجود اس ڈھانچے میں کوئی خاص جدت نہیں لائی جا سکی۔ سرکاری محکمے میں کوئی کام پڑ جائے تو بندہ ذلیل ہو جاتا ہے۔ یہ دفاتر عام لوگوں کے مسائل کیا حل کریں گے جو خوف کی علامت بن چکے ہیں۔ روزمرہ کے دفتری مسائل کو حل کرنے کا طریقہ انتہائی پسماندہ اور متروک ہے۔ عمران خان کی حکومت میں انتظامی ڈھانچے میں اصلاحات کے لئے عشرت عزیز کی سربراہی میں گھاگ بیوروکریٹوں پر مشتمل ایک کمیشن کی تشکیل کی گئی تھی جو کچھ کیے بغیر ہی تحلیل ہو گیا۔ مسائل اتنے گھمبیر اور پیچیدہ ہیں کہ اصلاحات محال ہیں۔

(60) معاشی بحران، سماجی انتشار اور سیاسی عدم استحکام میں امن وامان کے مسائل مزید گھمبیر ہو گئے ہیں۔ پولیس کو اگر وردی والے رہزن کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ کئی انکوائریاں ہو رہی ہیں جن میں پولیس اہلکار باقاعدہ ڈکیتیوں اور بھتہ خوری کی کاروائیوں میں ملوث پائے گئے ہیں۔ شفافیت پر کام کرنے والے عالمی اداروں کی رپورٹوں کے مطابق پولیس اور عدلیہ ملک کے کرپٹ ترین ادارے ہیں۔

(61) مشرف دور میں کی جانے والی پولیس ریفارمز اسی دوران میں ہی ناکام ہو چکی تھیں۔ اس کے بعد عمران خان دور میں پولیس اصلاحات کا شور اٹھا جو شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گئیں۔ پارکوں اور ناکوں پر پولیس صرف اس چکر میں ہوتی ہے کہ کوئی لڑکا لڑکی ہاتھ لگیں جن سے بلیک میلنگ کے ذریعے پیسے اینٹھے جائیں۔ یا پھر شراب پکڑنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ان حرکتوں سے ریاستی مشینری کی انتہائی رجعتی نفسیات کی عکاسی بھی ہوتی ہے۔

(62)(I) دیہی علاقوں میں ریاستی پولیس مقامی بااثر افراد کی ذاتی ملیشیا بن چکی ہے جس کے ذریعے ذاتی دشمنیاں نمٹائی جاتی ہیں اور رسہ گیری کی جاتی ہے۔ اس سارے کھیل میں غریب اور بے آسرا طبقات پس کے رہ جاتے ہیں۔ سب سے زیادہ جرائم اسی علاقے میں ہوتے ہیں جہاں پولیس کا گشت اور ناکے عام ہوتے ہیں۔

(62)(II) اسی طرح پولیس مقابلوں اور آپریشنوں وغیرہ میں جرائم پیشہ افراد سے زیادہ نقصان عام لوگوں کا ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ کچے کے علاقے کا معاملہ ہے جہاں ڈاکوؤں کے ساتھ ریاستی مشینری اور مقامی بااثر لوگوں کی ملی بھگت بھی موجود ہے اور ان کے خلاف جو آپریشن کیے جاتے ہیں ان میں بھی مقامی آبادیوں کے جان، مال اور فصلوں وغیرہ کا بیڑا غرق ہو جاتا ہے۔

(62)(III) اس علاقے میں ڈاکو راج کو تین دہائیوں سے زائد کا عرصہ گزر چکا ہے۔ ہر کچھ عرصے بعد ان کے خلاف آپریشن کیے جاتے ہیں جن کی لاگت اب اربوں روپے تک پہنچ چکی ہے۔ لیکن ان آپریشنوں میں بھی پولیس مقامی کسانوں کا غلہ اور اناج وغیرہ ہتھیا کے لے جاتی ہے

اوران کے گھر برباد کر دیئے جاتے ہیں۔لیکن اس دوران ڈاکو ''محفوظ'' ٹھکانوں پر چلے جاتے ہیں۔جبکہ پہلے سے مختلف الزامات میں گرفتار شدہ ملزمان کو کچے کے علاقوں میں لے جا کے مار دیا جاتا ہے۔بعض اطلاعات کے مطابق ایسے جعلی پولیس مقابلوں میں کئی مرتبہ بے گناہ لوگوں کا قتل بھی ہوتا ہے جس کی سپاری پولیس نے لے رکھی ہوتی ہے۔جبکہ حقیقی پولیس مقابلہ اگر ہو تو مرنے والے پولیس اہلکار ہی ہوتے ہیں۔یا پھر ڈاکوؤں کی باہمی لڑائیوں میں ہی ڈاکو مارے جاتے ہیں۔

(62) (IV) مبینہ طور پر بلوچی زبان بولنے والے ڈاکوؤں کو ریاستی اداروں کی طرف سے تحفظ اور سہولیات فراہم کر کے بلوچ علیحدگی پسندوں کے خلاف بھی استعمال میں لایا جاتا ہے۔ ان علاقوں میں کارروائیوں سے جڑے بڑے پولیس افسران، جن کو انعامات سے نوازا جاتا ہے، اب ارب پتی بن چکے ہیں۔

(63) پولیس کی اس حالت کے پیش نظر پھر گھمبیر صورتحال میں فوج، رینجرز یا دوسرے نیم فوجی دستوں کی مدد لی جاتی ہے۔یہ طریقہ کار فوری نتائج تو دے سکتا ہے لیکن جب ان اداروں کے اہلکار لمبے عرصے تک ایک کرپٹ نظام معاشرت کے ساتھ ربط میں رہتے ہیں تو بدعنوانی کی مختلف شکلیں ان میں بھی سرایت کرنے لگتی ہیں۔

(64) عملاً دیکھا جائے تو ریاست اور حکومت کے نظام پر فوج (یا زیادہ باریکی سے بات کریں تو 'ڈیپ سٹیٹ') کا کنٹرول ہے۔اگرچہ یہ تمام صورتوں میں حتمی یا قطعی نہیں ہوسکتا اور بہت سے معاملات کو سنبھالنے میں انہیں خاصی دشواری کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔لیکن خارجہ پالیسی، سکیورٹی اور معیشت کے معاملات پر یہ ڈیپ سٹیٹ ایک فیصلہ کن اثر ورسوخ رکھتی ہے۔ان کی حکم عدولی کرنے والے سول حکمرانوں کو بہت پریشانی کا سامنا کرنا پڑسکتا ہے۔یوں جہانگیر کرامت کا 'قومی سلامتی کونسل' کا وژن آج ایک قانونی اور سرکاری حیثیت حاصل کر چکا ہے۔

(65) چین اور امریکہ جیسے سامراجی ممالک کے حکمران جانتے ہیں کہ طاقت کا اصل منبع و مرکز کہاں ہے۔لہٰذا آخری گارنٹی کے طور پر وزیراعظم کی بجائے آرمی چیف سے ملاقات کو ترجیح

دیتے ہیں۔آئی ایم ایف جیسے ادارے بھی ڈھکے چھپے انداز میں یہی طریقہ کار اپناتے ہیں اور سعودی عرب بھی امدادی تیل اور ڈالر کے ذخیرے آرمی چیف سے ملاقات کے بعد ہی جاری کرتا ہے۔اس حوالے سے آرمی چیف کی تعیناتی ایک عالمی اہمیت کا حامل مظہر ہوتی ہے۔

(66) تاہم ریاست میں موجود ریاست کے اس غلبے اور بالادستی کے باوجود ریاستی بحران نہ صرف اپنے عروج پر ہے بلکہ کئی حوالوں سے اس ڈیپ سٹیٹ کو اپنی گرفت مزید مضبوط کرنے پر مجبور کرتا ہے۔لیکن یہ صورتحال بھی ریت کو مٹھی میں قید کرنے کی کوشش جیسی ہوتی ہے۔کیونکہ یہ ریاست جس زوال پذیر سرمایہ داری پر استوار ہے وہی متروک ہو کے سماجوں کو آگے لے جانے کی صلاحیت کھو چکی ہے۔

(67) اس نظام کے سنجیدہ ماہرین اور دانشور ریاست کے اس بحران سے آگاہ بھی ہیں اور پریشان بھی۔مگر وہ اس کا حل اسی نظام کے اندر تلاش کرتے ہیں۔جو ظاہر ہے ناممکن ہے۔سابق گورنر سٹیٹ بینک اور ماہر معیشت شاہد حفیظ کاردار کے مطابق پاکستانی معیشت کی ترقی کے لئے ہمہ جہت اور طویل المدت بنیادی اصلاحات درکار ہیں۔جس میں تعلیم اور صحت جیسے شعبوں کی بھاری ترقی کے ذریعے ہی وہ ہنرمند اور صحتمند لیبر فورس جنم لے سکتی ہے جو معاشی ترقی کی بنیادی ضرورت ہے۔لیکن اس سب کے لئے جو دیوہیکل وسائل درکار ہیں وہ کہاں سے آئیں گے؟

(68) موجودہ حالات سے پریشان حکمران طبقے کا ایک حصہ سنجیدگی سے نظام میں لبرل اصلاحات کا خواہاں ہے۔جس کا اظہار حالیہ مہینوں میں مفتاح اسماعیل اور شبر زیدی وغیرہ کی باتوں میں کھل کے ہوا ہے۔مفتاح اسماعیل نے تو اس سلسلے میں لبرل اصلاحات کے ایک معاشی اور سیاسی پروگرام کے گرد ایک سیاسی گروہ یا دھڑا بھی بنانے کی کوشش کی ہے۔اسی طرح ماضی میں نواز شریف کے فوج سے تصادموں میں بھی ''سویلین بالادستی'' کی کوششوں کا کلیدی کردار رہا ہے جن کا مقصد بنیادی طور پر ریاستی امور یا پالیسیوں کو لبرل بورژوا تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا تھا۔یا آسان الفاظ میں بات کریں تو فوج کا کردار کم کر کے سیاسی و معاشی فیصلہ سازی میں بورژوازی کا

اثر ورسوخ بڑھانا تھا۔ جس کے پیچھے ظاہر ہے ان کے معاشی مفادات ہی کارفرما ہیں۔

(69) اس صورتحال میں یہ پاکستانی لبرل بورژوازی کم وبیش انہی المیوں کا شکار ہے جن سے روس کے حکمران طبقات کے لبرل دھڑے انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کی شروعات میں تھے۔ یہ لوگ نہ صرف معاشی وسیاسی طور پر اپنی تاریخی تاخیر زدگی کی وجہ سے کمزور ہیں بلکہ بہت سے حوالوں سے پھر اسی ریاست پر منحصر ہیں۔ بلکہ غور کریں تو دوسری چیز پہلی سے جڑی ہوئی ہے۔ ان میں سے سنجیدہ لوگ جو عملی سیاست، کاروبار اور ریاستی امور کا کچھ تجربہ رکھتے ہیں اس حقیقت سے آگاہ بھی ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ یہ سماج جتنا بدحال اور محروم ہے، یہ خود جتنے بدعنوان ہیں اور یہاں قومی وطبقاتی استحصال کی جو شدت ہے اس کے پیش نظر ریاستی جبر وتسلط ناگزیر ہے۔ جس کا اوزار پھر یہی فوج اور سکیورٹی ادارے ہیں۔ لہٰذا یہ اسی ریاستی سیٹ اپ میں اپنی عملداری بڑھانے کی سعی کرتے ہیں جس کے لئے انہیں کبھی 'انقلابی' بننا پڑتا ہے تو کبھی بارگیننگ اور منت ترلے سے کام لینا پڑتا ہے۔

(70) دوسری طرف مخصوص تاریخی عوامل، جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، کے تحت عسکری اشرافیہ کے مالیاتی وکاروباری عزائم جس نہج پہ پہنچ چکے ہیں وہاں سے انہیں رول بیک کرنا ان لبرل اصلاح پسند دھڑوں کے لئے ناممکن ہو چکا ہے۔ جیسے شیر کے منہ کو خون لگ جاتا ہے بالکل اسی طرح ریاست کے ان آقاؤں کے منہ کو پیسہ لگ چکا ہے۔ جس کی ہوس بڑھتی جاتی ہے۔ نتیجتاً ریاست، سیاست اور ثقافت کے ہر شعبے میں مداخلت اور وہاں اپنی اجارہ داری قائم کرنے کی کوشش ان کی مجبوری بن چکی ہے۔ اس کے علاوہ ملک کی نازک سکیورٹی صورتحال بھی، جو انہی کے کرتوتوں کا نتیجہ ہے، ان کی مزید مداخلتوں کو ابھارتی ہے۔ یہی وجہ ہے عمران خان پراجیکٹ کی ناکامی کے بعد بھی وہ پسپائی اختیار کرنے کو تیار نہیں ہیں بلکہ مزید جارحیت پہ اترتے جا رہے ہیں۔ لیکن جب نواز شریف جیسے جب پرانی تنخواہ پہ کام کرنے کو تیار ہوں تو انہیں پسپا ہونے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ یہی اس بورژوازی کا تاریخی کردار ہے۔

(71) ان حالات میں تعلیم و علاج کے سرکاری شعبہ جات کی صورتحال بھی دگرگوں؛ بلکہ شرمناک ہو چکی ہے۔ تعلیم اور صحت سمیت بنیادی سماجی ضروریات کی فراہمی کا نظام انتہائی خستہ حالی اور متروکیت کا شکار ہے۔ سرکاری سکول اور ہسپتال؛ تعلیم اور علاج کی فراہمی کی بجائے جہالت اور اذیت کے گڑھ بن چکے ہیں۔ انسانیت کی تذلیل میں تھانوں اور عدالتوں کے بعد شاید سرکاری ہسپتالوں کا نمبر آتا ہے۔ لیکن اس بچے کھچے سرکاری نظامِ صحت کو بھی مزید کانٹا چھانٹا جا رہا ہے جس میں ہسپتالوں کی براہِ راست نجکاری سے لے کر صحت کارڈ جیسے فراڈ بھی شامل ہیں۔ جن کا مقصد نجی شعبے کو نوازنا اور علاج کا خرچہ مریضوں کی جیب سے نکلوانا ہے۔ بیشتر تکلیف دہ بیماریوں کا علاج ان کارڈوں پر نہیں کیا جاتا ہے۔ نہ ہی ان کے ذریعے تمام دوائیاں ملتی ہیں۔ علاوہ ازیں کارڈ میں موجود رقم پوری ہو جانے پر مریض کے پاس اپنی جیب سے پیسے دینے یا علاج ترک کرنے کے سوا کوئی آپشن نہیں ہوتی۔ یوں یہ مفت علاج کی ذمہ داری سے سرکاری دستبرداری کی بڑی پرفریب شکل ہے۔

(72) ان سرکاری اداروں کی یہ حالت پھر عوام کو یہ سہولیات منڈی سے خریدنے پہ مجبور کرتی ہے۔ جہاں بے تحاشہ منافعوں نے نجی شعبے کی مداخلت کو ریاستی سہولت کاری کے ذریعے انتہائی پرکشش بنایا ہے۔ خود حکومت کی رپورٹ ہے کہ ملک میں علاج پر ہونے والے کل اخراجات کا 60 فیصد لوگ اپنی جیب سے ادا کرتے ہیں۔ اس چکر میں ان کی جمع پونجی اور جائیدادیں تک بک جاتی ہیں۔ اسی طرح تعلیم حاصل کرنے والے نصف بچے پرائیویٹ سیکٹر سے تعلیم خرید رہے ہیں۔ لیکن ایسے میں لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد ان اخراجات کو برداشت نہ کر سکنے کی وجہ سے ناخواندگی اور لاعلاجی میں ہی سسکنے پہ مجبور ہو چکی ہے۔

(73) جو تعلیم ان اداروں میں دی جاتی ہے وہ جدید سماج کے تقاضوں سے قطعاً میل نہیں کھاتی۔ یہ دقیانوسی نصاب معیشت کو ترقی دینے اور سماج کو آگے لے جانے کے قابل نہیں ہیں۔ میڈیکل اور انجینئرنگ سمیت تعلیم کے مختلف شعبوں میں نجی سرمایہ کاری صرف منافع خوری کے

لئے کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جوں جوں نجی شعبہ اس میدان میں آگے آیا ہے، تعلیم کا معیار گرتا گیا ہے۔ نجی ہسپتالوں کی بات کریں تو وہاں بھی لوٹ مار کے نئے ریکارڈ ہر روز بنتے جا رہے ہیں۔ نجی تعلیمی اداروں اور ہسپتالوں کا یہ ابھار بنیادی طور پر ریاست کی جانب سے تعلیم و علاج کی مفت یا سستی فراہمی سے انکار کے مترادف ہے۔

(74) تاریخ گواہ ہے کہ ایک خوشحال، پڑھا لکھا، صحتمند اور باہنر معاشرہ تعلیم، صحت، ٹرانسپورٹیشن اور ہاؤسنگ وغیرہ جیسی بنیادی سہولیات میں دیوہیکل ریاستی سرمایہ کاری اور پلاننگ کے ذریعے ہی ابھر سکتا ہے۔ اس کے بغیر ایک جدید صنعتی اور جمہوری سماج کی بنیادیں ہی استوار نہیں ہو سکتیں۔ خود پاکستان کی حالت اس حقیقت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

(75) سامراجی محتاجی، معیشت کے خساروں، وسیع و عریض بدعنوانی اور داخلی خلفشار اور دھڑے بندی سے دوچار اس ریاست کے تحت یہ معاشرہ مزید گھٹن، بربادی اور گراوٹ کا شکار ہی ہوگا اور اس نظام کو جڑ سے اکھاڑے بغیر اس خطے کے محنت کش عوام کی خوشحالی اور آسودگی کے راستے مسدود ہی رہیں گے۔

*****

(76) عام طور پہ حکمران طبقات کی سیاست، ریاست کو اپنے تقاضوں کے مطابق ڈھالتی ہے۔ لیکن مخصوص تاریخی ادوار سے ہٹ کے پاکستان میں ریاست نے سیاست کی سمتوں اور ترجیحات کا تعین کیا ہے۔ ان کی کوشش رہی ہے کہ ایسا ہر سیاسی رجحان جو جزوی طور پر بھی کسی ترقی پسندی یا انقلابیت کا حامل ہو یا کسی اور حوالے سے ان کے کنٹرول سے باہر ہو، اسے خرید لیا جائے یا بصورت دیگر کچل کے رکھ دیا جائے۔ یوں یہاں کی مروجہ سیاسی پارٹیاں بڑی حد تک اسی ریاست کا عکس پیش کرتی ہیں۔

(77) ایسے میں کم و بیش تمام مروجہ سیاسی پارٹیاں ریاست کی پیداوار ہیں۔ ماسوائے مختلف تاریخی عوامل سے جنم لینے والی کچھ قوم پرست پارٹیوں اور پیپلز پارٹی کے، جس کا جنم

69-1968ء کے انقلاب سے ہوا۔ لیکن ان سیاسی رجحانات کو بھی بڑی حد تک قابو کر لیا گیا ہے۔ بالخصوص ان کی قیادتیں آج ریاستی کاسہ لیسی میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔

(78) 1980ء کی دہائی تک دائیں اور بائیں بازو کی سیاسی تقسیم کی وجہ سے پیپلز پارٹی، نیپ اور بعد ازاں اے این پی وغیرہ میں کسی حد تک نظریاتی بحث اور کیڈر سازی کا رجحان موجود تھا۔ جو سوویت یونین کے انہدام، مزدور تحریک کی پسپائی، سیاست اور سماج کی عمومی زوال پذیری، کالے دھن کی سرایت اور نیولبرلزم کی یلغار کے ساتھ کم وبیش معدوم ہو چکا ہے۔ ایسے میں موقع پرستی اور بدعنوانی پارٹیوں کی نچلی سطح تک سرایت کرتی گئی ہے۔ اگرچہ کسی حد تک نظریاتی اور دیانتدار کارکنان اب بھی مل سکتے ہیں۔ لیکن ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔

(79) اس نظریاتی و سیاسی گراوٹ نے مروجہ پارٹیوں کو ریاستی گماشتگی اور کرپشن کے تقاضوں کے مطابق ڈھالا ہے جس سے ان کی سیاست، ڈھانچے اور ڈسپلن اندر سے بالکل کھوکھلے ہو کے رہ گئے ہیں۔ پارٹی پروگرام اور پالیسیوں کی بحثیں ختم ہو گئی ہیں اور مالی مفادات، حکومتی مراعات، ٹھیکوں، سفارشی نوکریوں اور دولت کا حصول ہی مطمع نظر بن گیا۔ ماضی کے نظریاتی کارکنان بھی ان نئی شکلوں میں ڈھل گئے ہیں یا سائیڈ لائن کر دیئے گئے ہیں۔ مفاد پرستی کا یہ زہر اوپر سے نیچے تک سرایت کر گیا۔ نچلی سطحوں پر بھی پارٹی وابستگی چھوٹے چھوٹے کام نکلوانے اور معمولی مالی مفادات سے جڑ چکی ہے۔

(80) اس کیفیت سے جماعت اسلامی جیسی مذہبی دائیں بازو کی 'نظریاتی' پارٹیاں بھی بچ نہیں سکی ہیں اور سیاسی جماعت سے زیادہ این جی او بن کے رہ گئی ہیں۔ حتیٰ کہ ماضی کے جن جہادی گروہوں کو سیاسی شکل میں ڈھالنے کی کوشش کی گئی ہے ان میں بھی 'فلاحی کاموں' سے جڑی چندہ خوری اور دوسری بدعنوانیوں کا راج ہے۔ اب انہی بنیادوں پر یہ مذہبی رجحانات اپنے کارکنان کو جوڑے رکھنے اور متحرک کرنے کے قابل ہیں۔ لیکن پھر لبرل دائیں بازو اور اصلاح پسند بائیں بازو کی پارٹیوں کا حال بھی مختلف نہیں ہے۔

(81) حکمرانوں کی آپسی چپقلش میں ریاستی آشیر باد سے ایک نئے بنیاد پرستانہ رجحان کے طور پر ٹی ایل پی کا ابھار بھی ہوا ہے جس نے نہ صرف پیٹی بورژوازی بلکہ محنت کش طبقے کی پچھڑی ہوئی پرتوں میں بھی سیاسی و انتخابی مقبولیت حاصل کی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو ٹی ایل پی کا تعلق اکثریتی فرقے سے ہونا ہے۔ لیکن اس میں سیاسی خلا اور حبس پر مبنی سماجی ماحول کا عنصر بھی کارفرما ہے۔ لیکن پھر نہ صرف ہیئت بلکہ نظریاتی ماہیت کے حوالے سے بھی اس رجحان کی سیاست اتنی پسماندہ ہے کہ اس غیر انقلابی یا نیم رجعتی معروض میں بھی وسیع تر عوام اسے سنجیدہ لینے کو تیار نہیں ہیں۔ دوسرا پھر ان کی تشدد، جلاؤ گھراؤ اور توڑ پھوڑ وغیرہ کی عادت ہے جسے کچھ صورتوں میں تو ریاست نے استعمال کیا۔ لیکن پھر جب یہ حد سے تجاوز کرنے لگے تو ان کے پر پرزے کاٹنے پڑے۔ بالخصوص بانی کی موت کے بعد انہیں ریاستی شکنجے میں مضبوطی سے کس لیا گیا ہے۔ عام لوگوں کو بھی ان حقائق کا ادراک ہے کہ ان کی ڈوریاں کہاں سے ہلائی جاتی ہیں۔ بلکہ ان کے اپنے حامیوں اور کارکنان میں بھی ریاست کے سامنے قیادت کے بالکل خصی ہو جانے سے بددلی پھیلی ہے۔

(82) مجموعی طور پر بات کریں تو بنیاد پرستی کی ایسی روایتی شکلوں کی ساکھ وقت کیساتھ بڑی حد تک گری ہے۔ کیونکہ ایک طرف تو حالات و واقعات نے ان کی ریاستی مینوفیکچرنگ اور استعمال کا عمل بے نقاب کیا ہے۔ پھر لاکھوں لوگوں کا قتل عام کرنے والے دہشت گردوں سے ان کی ہمدردی بھی عوام میں غم و غصے کا باعث بنی ہے۔ علاوہ ازیں ادھوری جدت پر مبنی سماجی ارتقا میں بھی عوام کے ایک بڑے حصے نے یہ ادراک حاصل کیا ہے ان رجحانات کے دقیانوسی نعرے اور پروگرام سراسر منافقت پر مبنی اور ناقابل عمل ہیں۔ ایسے میں یہ بنیاد پرست' ریاستی پشت پناہی اور کالے دھن پر مبنی اپنی ظاہری دھاک اور دہشت کے باوجود خود کو فیصلہ کن طور پر سماج پہ مسلط کرنے سے قاصر ہیں۔ حتیٰ کہ مذہبی سوچ رکھنے والے بہت سے لوگ بھی اب ان کے پیچھے نہیں چلتے ہیں۔

(83) اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مذہبی رجعت اور قدامت پسندی کی سماجی بنیادیں ختم ہو گئی ہیں۔ بلکہ حکمرانوں کو اسے نئی پیکنگ اور نئی شکلوں میں لانے کی ضرورت پڑ گئی ہے۔ عمران

خان بنیادی طور پر ماڈرنزم میں لپٹی مذہبیت کا ایسا ہی مظہر ہے۔ جو پاکستان کی تعلیم یافتہ مڈل کلاس کی سوچ، ثقافت اور امنگوں سے میل کھاتا ہے۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ گزشتہ کچھ عرصے سے جماعت اسلامی نے بھی خود کو ایک 'ماڈرن' شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ یہ خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں کر پائی۔

(84) بہرحال معروضی حالات میں طبقاتی جدوجہد کے ابھار پر مبنی بنیادی تبدیلی تک مذہبیت، بنیاد پرستی اور قدامت پسندی کے ایسے رجحانات مختلف شکلوں اور مختلف شدتوں کے ساتھ ابھرتے رہیں گے۔ جس میں تحریک انصاف جیسے ملغوبے بھی شامل ہیں۔ زیرِ نظر دستاویز میں آگے معاشرت کی بحث میں اس مظہر پر مزید روشنی ڈالی گئی ہے۔

(85) اسی طرح ایم کیو ایم کا مظہر ہے جو بنیادی طور پر مترو کیت کا شکار ہو کے ٹوٹ پھوٹ سے دوچار ہوا ہے۔ جبر، تشدد اور غنڈہ گردی کی حدود ہوتی ہیں۔ ان طریقوں سے ایک وقت تک ہی اپنی سیاسی اور سماجی اجارہ داری قائم رکھی جا سکتی ہے۔ وہ بھی ان حالات میں جب ریاست کو ایک اوزار اور آلہ کار کے طور پر ایسے فسطائی رجحانات کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن یہ ضرورت صدا نہیں رہا کرتی۔

(86) کراچی کی اردو سپیکنگ مڈل کلاس میں بھی ایم کیو ایم سے شدید بیزاری موجود تھی۔ جس کا اظہار 2013ء میں تحریک انصاف کو ملنے والے ووٹوں کی صورت میں ہوا۔ جس سے پھر الطاف حسین کا پاگل پن مزید بگڑ گیا اور اس نے وہ ہذیان بکا کہ ایم کیو ایم کی کانٹ چھانٹ کا پہلے سے جاری عمل اسے عملاً کچل کے رکھ دینے کی نہج تک پہنچ گیا۔

(87) آج اس وحشت کی پرچھائی ہی باقی بچی ہے۔ جسے کبھی تین چار جماعتوں میں توڑ دیا جاتا ہے اور کبھی دوبارہ ایک پریشر گروپ کے طور پر جوڑ لیا جاتا ہے۔ لیکن ان کا ڈنگ نکال لیا گیا ہے۔ مڈل کلاس سے ابھرنے والے ان نام نہاد سیاسی کارکنان نے وحشت اور دہشت کی انتہاؤں پہ جا کے مال تو بہت بنایا لیکن ان کا ماضی اور پھر حال دیکھیں تو ان پہ ترس کھانے کو دل کرتا

ہے۔لیکن یہ کسی رحم کے مستحق بہرحال نہیں ہیں۔

(88) سیاست میں سیاہ وسفید پیسے کی بڑی مداخلت کے نتیجے میں جس کے پاس جتنا زیادہ سرمایہ تھا وہ اتنا بڑا پارٹی عہدیدار بن گیا۔ جب نظریات اور پروگرام کی سیاست ہی نہ رہی (بینظیر کے الفاظ میں نظریات ''بیک سیٹ'' پر چلے گئے) تو پاور پالیٹکس کے لئے درکار سرمایہ پیسے والے ہی فراہم کر سکتے تھے۔ جس سے وہ پارٹیوں کی فیصلہ ساز پوزیشنوں پر براجمان ہوتے گئے۔ اس کے ساتھ ڈیپ سٹیٹ کے پکے ایجنٹوں کی پیوندکاری بھی ان سیاسی پارٹیوں میں کی گئی تا کہ اندر کی مکمل خبر رکھی جائے اور قیادتیں اگر کبھی انحراف کی کوشش بھی کریں تو انہیں نکیل ڈالی جا سکے۔

(89) تحریک انصاف، ن لیگ اور پیپلز پارٹی سمیت ان پارٹیوں کے ڈسپلن کی یہ حالت ہے کہ یہ نازک ترین معاملات پر بھی اعلیٰ قیادت کے اجلاسوں کی کاروائی خفیہ رکھنے سے قاصر ہیں۔ اجلاس بعد میں ختم ہوتا ہے' اس کی کاروائی پہلے ریاستی ایجنسیوں اور میڈیا تک پہنچ چکی ہوتی ہے۔

(90) جوں جوں الیکشن پیسے اور دھونس کا کھیل بنتے گئے' پارٹی ٹکٹ بھی سرمایہ داروں، دھنوانوں اور رسہ گیروں کو بانٹے جانے لگے۔ دکھاوے کے لئے کچھ ٹکٹیں، جو بالعموم کمزور پوزیشن والے حلقوں کی ہی ہوتی ہیں، غریب یا مڈل کلاس کارکنان کو دے دی جاتی ہیں۔ اسی طرح کبھی کبھار غریب پس منظر یا مذہبی اقلیتوں سے تعلق رکھنے والی خواتین کو مخصوص نشستوں پہ اسمبلیوں میں بھیج دیا جاتا ہے۔ تا کہ خانہ پری بھی ہو جائے اور ان طبقات کے کارکنوں میں سیاسی کیریئرازم کی امنگیں اجاگر کر کے ان کو اپنی بدقماش سیاست کا ایندھن بھی بنایا جائے۔

(91) ایسی بالکل استثنائی صورتوں میں بھی محروم طبقات کے لوگ جب طاقت کے ان ایوانوں کا حصہ بنتے ہیں تو زیادہ تر انہی کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں اور شاہ سے زیادہ شاہ کے وفادار بن جاتے ہیں۔ انہیں پھر انہی کے طبقے کے خلاف ایسے پرفریب طریقوں سے استعمال کیا جاتا ہے کہ گماشتگی اور ضمیر فروشی کی ہر حد پار ہو جاتی ہے۔

(92) یوں نظریاتی طور پر انتہائی پکے، سنجیدہ، دیانتدار اور انقلابی مقاصد کے لئے لڑنے

مرنے پر تیار لوگ ہی ان ایوانوں میں جا کے ان کی اصلیت عام لوگوں کے سامنے بے نقاب کرنے کا تاریخی فریضہ انجام دے پاتے ہیں۔ جیسے بالشویک پارٹی کے اراکین دوما ہوا کرتے تھے جو ریاست کی دلالی کی بجائے اسمبلی سے سیدھا جیل جانے کو ترجیح دیتے تھے۔ لیکن یہ انقلابی کام کا اس قدر کٹھن اور امتحان میں ڈال دینے والا شعبہ ہے کہ ان میں سے بھی کچھ لوگ ٹوٹ جاتے تھے۔

(93) ایسے میں مزدوروں کو پارلیمنٹ میں بھیج کے مزدور دوست پالیسی سازی کروانے کا اصلاح پسندانہ خواب ایک حماقت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس پارلیمان کے اختیارات اور سالمیت کی حقیقت گزشتہ کچھ سالوں میں بالکل واضح ہو کے سامنے آئی ہے۔ جہاں اقلیت کو اکثریت اور اکثریت کو اقلیت میں تبدیل کیا جاتا رہا ہے۔ حکمران طبقے کے جن نمائندوں کے اپنے ووٹ کی کوئی وقعت نہ ہو وہ عوام کے ووٹوں کو کیا عزت دیں گے۔ ڈیپ سٹیٹ نے اس پارلیمنٹ کو ''Manage'' کرنے کے لئے اپنی ایجنسیوں میں باقاعدہ شعبے قائم کر رکھے ہیں جو مطلوبہ نتائج کے لئے نہ صرف پیسے اور دھونس کا استعمال کرتے ہیں بلکہ بات ممبران کو ''اٹھانے'' تک بھی جا سکتی ہے۔ ایک بار پھر حالیہ بحرانی عرصے میں ریاست کے بڑھتے ہوئے جبر کے ساتھ پارلیمنٹ کی ''مینجمنٹ'' بھی سخت ہی ہوئی ہے۔

(94) اس کا یہ مطلب نہیں کہ انقلابیوں کو مروجہ سیاست کے انتخابات اور دوسری سرگرمیوں سے بالکل کنارہ کشی اختیار کر لینی چاہئے۔ لیکن ان کا حکمران طبقے کی سیاست کو دیکھنے کا نقطہ نظر اور اس میں مداخلت کے مقاصد اصلاح پسندوں سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔

(95) بہرحال مروجہ سیاست کے مذکورہ حالات میں قیادتوں کی طرف سے بھی سنجیدہ اور دیانتدار سیاسی کارکنوں کی حوصلہ شکنی کی گئی ہے۔ ان لیڈروں کو ''لیس مین'' چاہئے ہوتے ہیں جو چند ٹکوں کے بدلے ان کی ہر غلاظت کا دفاع کر سکیں اور ہر حکم کے سامنے سر تسلیم خم کریں۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ بے نظیر نے اپنے پہلے اقتدار میں نظریات کو پچھلی نشستوں پر منتقل کر کے اس

سارے عمل پر اپنی مہر لگا دی تھی۔ جس کے بعد نیولبرل سرمایہ دارانہ پالیسیوں کا کھلے عام پرچار کیا گیا اور بڑی بے رحمی سے نجکاری، ڈی ریگولیشن اور ٹھیکیداری نظام کو لاگو کیا گیا۔ بے نظیر اس بات پر فخر کرتی تھی کہ وہ جنوب ایشیا کی پہلی رہنما ہے جس نے نیولبرل پالیسیوں کو متعارف کروایا۔

(96) اس کے بعد مختلف مراحل سے گزر کر پارٹی اپنی ساکھ محنت کش عوام میں کھوتی چلی گئی ہے۔ نظام سے مصالحت اور خود کو ''قابل قبول'' بنانے کی کوشش میں پارٹی قیادت' عوام کی امنگوں کو قتل کرتی گئی۔ آخر کار بے نظیر کے قتل کے بعد غریب اور بے آسرا عوام کے لئے پیپلز پارٹی سے وابستگی کا آخری شخصی دھوکہ بھی ختم ہو گیا۔ زرداری نے بنیادی نظریات اور عوامی مسائل کے حل کی سطحی لفاظی کو بھی رد کر کے بدعنوانی، حصہ داری اور ریاستی گماشتگی کی سیاست کو باقاعدہ پارٹی پالیسی کی شکل دے دی۔

(97) بینظیر کے قتل کے بعد پیپلز پارٹی کو ملنے والا اقتدار کئی حوالوں سے فیصلہ کن اہمیت کا حامل تھا۔ جس میں سرمایہ نواز پالیسیوں، قرضوں، مہنگائی، بدامنی اور لوڈ شیڈنگ کی بھرمار نے پہلے سے زخمی عوام کو روحانی، معاشی اور نفسیاتی طور پر اس قدر گھائل کیا وہ پارٹی سے بیگانہ ہو گئے۔ پارٹی عوام سے خالی ہونا شروع ہو گئی۔

(98) ان حالات نے تحریک انصاف کے ابھار کی راہ ہموار کی اور بالخصوص درمیانے طبقے کے نچلے حصوں سے تعلق رکھنے والے پارٹی سپورٹر کسی متبادل کی عدم موجودگی میں عمران خان کے دھوکے اور فریب شکار ہو گئے اور اپنے پیچھے محنت کش طبقے کی کچھ پرتوں کو بھی گھسیٹ کے لے گئے۔ جبکہ عوام کی ایک بڑی تعداد سیاسی عمل سے بیگانہ اور مایوس ہو کر گوشہ نشینی اور بے حسی کا شکار ہو گئی۔

(99) آج پیپلز پارٹی نے اپنے چہرے سے عوامی سیاست اور بائیں بازو کا نقاب اتار کے پھینک دیا ہے۔ ان کی ''ترقی پسندی'' کا ڈھونگ بھی زیادہ تر لبرل نوعیت کے اقدامات اور مطالبات تک ہی محدود ہوتا ہے۔ جبکہ معاشی میدان میں نیولبرل پالیسیوں کا اعلانیہ پرچار کیا جاتا ہے۔ پارٹی کی زوال پذیری میں ان پالیسیوں کے بنیادی کردار پر غور و فکر بھی چھوڑ دیا گیا ہے۔

کیونکہ ان کی ترجیحات ہی کچھ اور ہیں۔ زرداری کے نزدیک سازشی جوڑ توڑ اور خرید و فروخت کا نام ہی سیاست ہے۔ انتخابات سے قبل بلوچستان میں بھی جس قسم کے انتہائی رجعتی اور عوام دشمن عناصر سے اتحاد بنائے جا رہے ہیں یا انہیں براہِ راست پارٹی میں شامل کیا جا رہا ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ یہ ہر طرح کی شرم وحیا سے عاری ہو چکے ہیں۔

(100) بلاول بھی معاشی ترقی اور بہتری کے لئے بیرونی سرمایہ کاری، برآمدات میں اضافے اور نجی کاروباروں کو پروموٹ کرنے کا وہی راگ الاپتا ہے جو پہلے بے نظیر بھٹو الاپتی تھی۔ سرمایہ داری اگر اپنی جنم بھومیوں میں ہی ناکامی اور مشکلات کا شکار ہے تو پاکستان جیسے پسماندہ اور تاخیر زدہ ملکوں میں کیسے بحرانات پر قابو پا سکتی ہے۔ لیکن یہ کافی بڑی اور آگے کی سوچ ہے جو ان لوگوں کے چھوٹے ذہنوں میں نہیں سما سکتی۔

(101) اقتدار کا حصول اور اس کے بلبوتے پر سرمائے کا مزید اجتماع ان کا بنیادی مقصد بن چکا ہے۔ جس کے لئے پھر ہر حد تک جا کے مقتدرہ کے تلوے چاٹے جاتے ہیں۔ لیکن یہ ریاستی آقا بھی پارٹی کو اتنی ہی حیثیت دیتے ہیں جتنی اس کی عوامی حمایت اور اوقات ہوتی ہے۔ دراصل پیپلز پارٹی آج ریاست کے لئے اس طرح کے خوف یا پریشانی کا باعث نہیں ہے جیسے ماضی میں اپنی وسیع عوامی بنیادوں اور سیاسی قوت کی وجہ سے ہوا کرتی تھی۔

(102) بلاول کا حالیہ الیکشن منشور میں تنخواہیں بڑھانے اور بجلی سستی کرنے جیسے پاپولسٹ نعروں پر مبنی دس نکاتی پروگرام معاشی بنیادوں سے یکسر عاری ہے۔ اس میں کوئی ذکر نہیں کہ سرکاری سخاوت پر مبنی ان سارے اقدامات کے لئے پیسہ کہاں سے آئے گا۔ یوں یہ تحریک انصاف کے لاکھوں گھروں اور کروڑوں نوکریوں جیسے جھوٹے وعدے ہی ہیں۔ آئی ایم ایف کی جکڑ میں یہ عام لوگوں کی بہتری کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتے۔

(103) گزشتہ سال اگست میں نگران حکومت کو بجلی کے ظالمانہ بلوں کی اقساط تک کرنے کی اجازت آئی ایم ایف نے نہیں دی۔ جہاں بلوں کی قسطیں بھی نہیں ہو سکتیں وہاں سستی یا مفت

بجلی کہاں سے دی جاسکتی ہے۔ یوں سامراجی اداروں کے تسلط میں جکڑی پاکستانی معیشت میں کسی قسم کی عوام دوست اصلاحات ناممکن ہیں اور الیکشن سے پہلے اصلاحات کی نعرے بازیاں اور منشور محنت کش عوام کو دھوکہ اور فریب دینے کے سوا کچھ نہیں ہیں۔

(104) سیاسی پارٹیاں بھی زندہ اجسام کی مانند ہوتی ہیں۔ جنہیں زندہ اور تروتازہ رکھنے کے لئے ایسے نظریات اور پروگراموں کی ضرورت ہوتی ہے جو انہیں ووٹ دینے والے عوام کے سلگتے ہوئے مسائل کو حل کرسکیں۔ سرمایہ داری میں ان مسائل کا حل ایک دیوانے کا خواب بن چکا ہے۔ ایسے میں اس نظام کی ہر پارٹی اقتدار میں آکے تیزی سے اپنی ساکھ کھونے کی طرف جاتی ہے۔

(105) ن لیگ اپنی پیشرو مسلم لیگوں کی طرح ریاست کی ہی پیداوار ہے۔ بلکہ ریاست کی اضافی شاخ رہی ہے۔ ریاست کی مجبوری رہی ہے کہ وہ ایسی سیاسی پارٹیوں کی تشکیل کرے جو اس کے مفادات کا تحفظ کرسکیں۔ ن لیگ اسی عمل کے تسلسل کا نتیجہ ہے۔

(106) بورژوازی کی تاریخی نااہلی کی بدولت جو خلا پیدا ہوا اس نے مختلف مواقع پر خود ریاست کو سیاسی عمل میں براہ راست مداخلت پر مائل کیا۔ یہ رجحان پھر ریاستی آقاؤں کے مالیاتی مفادات کے ساتھ جڑتا گیا۔

(107) اس سب کے باوجود نواز شریف بہرحال صنعت اور فنانس سے وابستہ پاکستان کی پرانی بورژوازی کا نمائندہ ہے جس کے ذریعے حکمران طبقے کا یہ بالائی اور موٹا حصہ ایک معاشی ترقی سے سرشار ایسا پاکستان تعمیر کرنا چاہتا تھا جہاں وہ منافعوں کو بڑھا سکیں۔

(108) تاہم ن لیگ کے ابتدائی دوادوار میں نواز شریف اس حکومتی خودمختاری اور ریاستی طاقت کے حصول میں ناکام رہا جو خارجہ امور اور معیشت کے شعبے میں اسے اپنی مرضی کی پالیسیاں مرتب کرنے کی قابل بناتی۔ ہر بار فوج کے ساتھ اس کا ٹکراؤ رہا۔ لیکن یہ فوج کے اس وقت کی پیپلز پارٹی کے ساتھ ٹکراؤ سے مختلف نوعیت کا تھا۔

(109) لیکن ریاست کے پاس بھی نواز شریف کے مقابلے میں مین سٹریم دائیں بازو کی

کسی پارٹی کا آپشن موجود نہیں تھا جس کو وہ مکمل مطیع کر کے اپنی مرضی کی پالیسیاں لاگو کرواتے۔

(110) فوجی اشرافیہ کو اپنے مفادات کے تحفظ اور اپنی سماجی بنیادوں کو مضبوط بنانے کے لئے دیگر کئی معاملات کے علاوہ خارجہ پالیسی کے میدان میں ''دشمن ملک'' کی ضرورت تھی۔ جو نواز شریف کے کاروباری عزائم کے راستے میں بڑی رکاوٹ تھی۔ اسی طرح بنیاد پرست گروہوں کی ہینڈلنگ کے معاملات پر بھی اس کا ڈیپ سٹیٹ سے شدید جھگڑا پیدا ہوا جو 'ڈان لیکس' کے نام سے زبان زدِ عام بھی ہوا۔ عالمی سطح پر تنہائی کے خطرات اور سامراجی پریشر کے پیش نظر نواز شریف چاہتا تھا کہ پاکستان سمیت خطے میں مسلسل عدم استحکام پیدا کرنے والے جہادی گروہوں سے جان چھڑائی جائے۔ یہ کوئی نظریاتی مخاصمت نہیں تھی بلکہ اس لئے تھا کہ ایک نسبتاً پُرامن اور سازگار کاروباری ماحول میں سرمایہ دارانہ استحصال اور لوٹ مار جاری رہے۔ جبکہ یہاں کی ڈیپ سٹیٹ کے لئے وہ ایک اثاثے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یوں یہ لڑائی بھڑک کر بالآخر پانامہ کیس میں نواز شریف کی بے دخلی اور نااہلی پر منتج ہوئی۔ جس کے بعد عمران خان کو ایک متبادل کے طور پر لایا گیا۔ پس منظر میں تحریک انصاف کے پراجیکٹ پر طویل عرصے سے بالعموم اور 2011ء کے بعد سے بالخصوص کام جاری تھا۔

(111) ن لیگ بے لگام نیولبرل اقدامات کی نمائندہ جماعت ہے۔ لیکن یہ خاصے پریکٹیکل اور گھاگ بھی ہیں۔ جس کا اظہار اسحاق ڈار کی پالیسیوں سے بھی ہوتا ہے۔ طویل دورانیے کی تکلیف دہ سٹرکچرل اصلاحات کی بجائے یہ نمائشی ترقی کے ذریعے اپنے اقتدار کی ضمانت کو ایک کامیاب فارمولا سمجھتے ہیں۔ قرضوں، بڑے منصوبوں اور درآمدات وغیرہ کے ذریعے غیر مستحکم اور عارضی بنیادوں پر ہی سہی لیکن یہ معاشی نمو میں خاصا اضافہ کر جاتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ پھر انہیں آئی ایم ایف کے پاس بھی جانا پڑتا ہے۔ لیکن آئی ایم ایف کے پروگراموں سے نمٹنے میں بھی انہیں خاصی مہارت حاصل ہے۔

(112) نواز شریف سنجیدگی سے سمجھتا ہے کہ اس کی قیادت میں پاکستان خطے کی دوسری

طاقتوں کے مقابلے کی ایک معاشی قوت بن سکتا ہے۔ بشرطیکہ اس کی مجوزہ سیاسی اور معاشی پالیسیوں پر تسلسل سے عملدرآمد کیا جائے۔

(113) اقتدار سے بے دخلی کے بعد ''ووٹ کو عزت دو'' کے نواز شریف کے نعرے کو لبرل اور بائیں بازو کے اصلاح پسندانہ حلقوں میں خاصی مقبولیت ملی۔ مگر یہ سارا سیاسی عمل عوام کو اپیل کرنے والے کسی ٹھوس معاشی پروگرام سے عاری تھا۔ نہ ہی نواز شریف قید و بند کی صعوبتیں زیادہ عرصہ برداشت کر پایا۔ پھر اس کی پارٹی بھی کبھی کوئی مزاحمتی جماعت نہیں رہی اور اس کے اندر فوج نواز دھڑے نے اس ساری ایجی ٹیشن کا حصہ بننے سے انکار ہی کیا۔ یوں یہ نعرہ یا تحریک جلد ہی اپنی موت آپ مر گئی۔

(114) اب عمران خان حکومت کے ہائبرڈ تجربے کی بری طرح ناکامی کے بعد ایک طرف تحریک انصاف کی کانٹ چھانٹ جاری ہے۔ دوسری طرف ایک مرتبہ پھر نواز شریف کو اقتدار دینے کے لئے پورا زور لگایا جا رہا ہے۔ جس میں ظاہر ہیں بے پناہ رکاوٹیں حائل ہیں۔ اتنے دیوہیکل پیمانے پہ ایک سیاسی پراجیکٹ کو لانچ کر کے اسے اچانک رول بیک کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ اس حوالے سے خود ریاست کے اندر ایک تقسیم اور تصادم موجود ہے۔

(115) لیکن عمران خان حکومت کے خاتمے کے بعد پی ڈی ایم حکومت کے ڈیڑھ سال نے ن لیگ کو بری طرح غیر مقبول جبکہ عمران خان کو پہلے سے زیادہ مقبول کیا ہے۔ کبھی نہ دیکھی گئی مہنگائی کے ذریعے ریاست کو دیوالیے سے بچانے کے چکر میں یہ اپنی انگلیاں جلا بیٹھے ہیں۔ بدلے میں اگرچہ انہیں اگلے اقتدار کی ضمانت دی گئی ہے۔ لیکن یہ اقتدار عوامی حمایت یا ووٹوں سے زیادہ ریاستی بیساکھیوں کا محتاج ہوگا (بشرطیکہ سب کچھ پلاننگ کے مطابق انجام پا جائے)۔ یوں یہ حکومت پہلے سے بھی زیادہ کمزور اور ملکی و عالمی سطح پہ کسی خاطر خواہ ساکھ سے عاری ہوگی۔

(116) عمران خان کی مقبولیت ریاست اور ن لیگ دونوں کے لئے دردِ سر ہے۔ اسی لئے تحریک انصاف کے ہاتھ پیر باندھے جا رہے ہیں۔ بلے کا نشان بھی واپس لے لیا گیا ہے۔

لیکن ایسے اقدامات سے یہ الیکشن پہلے ہی بالکل پھیکے اور اعتماد سے عاری ہو چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عوام میں اس حوالے سے کوئی خاص سرگرمی اور جوش وخروش نظر نہیں آ رہا ہے۔ لیکن اس ساری ریاستی پلاننگ اور کنٹرول کے باوجود یہ غیر متوقع نتائج یا مضمرات کا باعث بن سکتے ہیں۔ جس میں عمران خان کی حمایتی مڈل کلاس کی فرسٹریشن ایک انتشار کو بھی جنم دے سکتی ہے۔

(117) بحران کی یہ حالت ہے کہ انتخابات سے دو ہفتے قبل بھی ان کے ملتوی یا منسوخ ہو جانے کی افواہیں گردش کر رہی ہیں۔ ایسے امکانات اگرچہ بہت کم ہیں لیکن پاکستان جیسے ممالک میں انہیں یکسر رد نہیں کیا جا سکتا۔

(118) نواز شریف 21 اکتوبر کو پانچ سال کی خود ساختہ جلاوطنی کے بعد بادل نخواستہ واپس آیا ہے۔ اس عرصے میں پی ڈی ایم کے ڈیڑھ سالہ کے اقتدار سمیت پارٹی کے بہت سے فیصلوں میں اس کی مرضی شامل نہیں رہی یا اس نے انہیں بھاری دل اور مجبوری سے ہی قبول کیا ہے۔

(119) دوسری پارٹیوں کی طرح ن لیگ بھی بھانت بھانت کے مفاداتی گروہوں اور دھڑوں پر مشتمل ہے جو نواز شریف کی قیادت کے بانڈ سے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ نواز شریف، مریم نواز کو اپنے سیاسی جانشین کے طور پر تیار کرتا آ رہا ہے لیکن اس معاملے پر نہ صرف پارٹی کے اندر بلکہ شریف خاندان میں بھی اختلافات موجود ہیں۔ یوں نواز شریف اگر کسی طرح منظر نامے سے ہٹتا ہے تو پارٹی گہری تقسیم اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو سکتی ہے۔

(120) ریاست اس وقت نواز شریف کو واپس لا کر کبھی نہ دیکھی گئی معاونت اور حمایت کے ذریعے اگلا اقتدار دینے کی تیاری کر رہی ہے۔ مگر نواز شریف سے ماضی کے ٹکراؤ اور تلخیاں بھی ان کے سامنے موجود ہیں۔ تاہم عمران خان والے ناکام تجربے کے بعد فوج کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی آپشن بھی فی الوقت نہیں۔ پیپلز پارٹی کا پنجاب، جو سب سے بڑا اور فیصلہ کن صوبہ ہے، سے تقریباً صفایا ہو چکا ہے۔

(121) اس بات کے قوی امکانات ہیں کہ اگلا حکومتی سیٹ اپ، جو نیشنل گورنمنٹ قسم کی

کوئی چیز ہوسکتا ہے، نواز شریف کی سربراہی میں ہی بنے گا۔ لیکن یہ اتحادیوں کی بیساکھیوں پر کھڑا ایک کمزور اقتدار ہوگا۔ جس میں ایک بار پھر 'ہائبرڈ' نظام حکومت کے عناصر شامل ہوں گے۔

(122) ریاست اس وقت ہر قیمت پر تحریک انصاف کو الیکشن میں بہت محدود شمولیت کرنے دینا چاہتی ہے۔ لیکن تحریک انصاف کے نمایاں قائدین پر مقدمے، جبر اور تشدد سے انہیں پارٹی سے منحرف کروانے کی کوششیں، گرفتاریاں، کاغذات نامزدگی میں رکاوٹیں، انتخابی نشان کی منسوخی وغیرہ جیسے اقدامات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس معاملے کو ڈیل کرنے میں انہیں کافی مشکلات کا سامنا ہے۔ علاوہ ازیں ان کی یہ کھلی جانبداری نہ صرف ملکی بلکہ عالمی سطح پر بھی مسائل کا باعث بن رہی ہے۔ دی اکانومسٹ میں عمران خان کے مضمون کی اشاعت ایک بار پھر اشارہ دیتی ہے کہ عالمی سامراج کے کچھ حلقوں میں اس کی حمایت یا لابنگ موجود ہے۔

(123) عمران خان پھر سے مروجہ سیاست کی مقبول ترین شخصیت بن چکا ہے۔ اس کی حکومت کی انتہائی عوام دشمن پالیسیاں اور معاشی حملے پس منظر میں چلے گئے ہیں اور وہ خود کو ایک مظلوم کے طور پر پیش کرنے میں کامیاب رہا ہے۔

(124) ساڑھے تین سالہ اقتدار میں انتہائی رجعتی سیاسی و سماجی پالیسیوں، آئی ایم ایف کی بھرپور گماشتگی، بے تحاشہ قرضوں، مہنگائی، کرپشن اور انتہائی بری انتظامی کارکردگی نے تحریک انصاف کی ساکھ کو بہت بری طرح متاثر کیا تھا۔ لیکن اپنے مخصوص طبقاتی کردار کی وجہ سے اس سارے سیاسی مظہر میں عمران خان کی شخصیت پرستی، جو کبھی پوجا کی حدوں کو بھی چھونے لگتی ہے، کا بڑا مضبوط رجحان موجود ہے۔ ایسے میں عمران خان کی اقتدار سے جبری بے دخلی اور پھر گرفتاری نے اس کے پیروکاروں کو پھر سے اندھی عقیدت اور حمایت کا جواز مہیا کر دیا۔

(125) دراصل اس کے مقابلے میں وہی پرانی سیاسی پارٹیاں ہیں جن کو عوام اپنے تمام مسائل کا ذمہ دار سمجھتے ہیں۔ ان میں نئی ابھرنے والی پروفیشنل اور پڑھی لکھی شہری مڈل کلاس کا ایک بڑا حصہ شامل ہے۔ پی ڈی ایم کے ڈیڑھ سالہ دورِ حکومت کی بربادی نے اس تاثر کو اور بھی مضبوط

کیا ہے۔ جس کے بعد کاروباری پیٹی بورژوازی، جو تاریخی طور پر ن لیگ کی سماجی بنیاد رہی ہے، کے کئی حصے بھی عمران خان کے حمایتی ہو گئے ہیں۔

(126) لیکن عمران خان کی بے دخلی کے بعد سے ریاست اپنی داخلی تقسیم، تذبذب اور عدم اعتماد کی وجہ سے بھی تحریک انصاف کو کرش کرنے کے بہت سے مواقع گنواتی گئی ہے۔ عمران خان کو اقتدار سے نکالتے وقت اور پھر 9 مئی کے فوراً بعد ایسے مواقع موجود تھے کہ ایک بڑے کریک ڈاؤن اور جبر کے ذریعے تحریک انصاف کو یکسر ختم نہیں تو بڑی حد تک محدود اور خصی کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اوپر بیان کیے گئے عوامل کی وجہ سے ایسا نہ کیا جا سکا۔ نتیجتاً اسے ایک بتدریج انداز سے 'کٹ ٹو سائز' کرنے کی پالیسی اپنائی گئی ہے جو اگر ناکام نہیں تو خاصی تکلیف دہ اور مشکل ثابت ہو رہی ہے۔ اگرچہ ریاستی مشینری (بالخصوص عدلیہ اور ڈیپ سٹیٹ) میں موجود تحریک انصاف کے حامیوں کو بڑی حد تک دبا دیا گیا ہے یا فارغ کر دیا گیا ہے۔

(127) تحریک انصاف درمیانے اور نچلے درمیانے طبقے کی حمایت پر مشتمل ایسی پارٹی ہے جو بنیادی طور پر وائٹ کالر ملازمین اور پڑھے لکھے نوجوانوں میں گہری جڑیں رکھتی ہے۔ لیکن کسی ٹھوس سیاسی ڈھانچے اور لائحہ عمل سے محروم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ریاستی دباؤ کے تحت قیادت کا بیشتر حصہ تتر بتر ہو گیا ہے اور ڈھانچے موجود نہ ہونے کی وجہ سے یہ عدم مرکزیت کا شکار ہو کر کافی حد تک بکھر گئی ہے۔ عمران خان کی حمایت کی صورت میں اس کا ووٹ بینک بہر حال قائم ہے۔ بلکہ پہلے سے بڑھا ہے۔ یہی ریاستی پالیسی سازوں کے لئے ایک مسئلہ بنا ہوا ہے۔ عمران خان دراصل اپنی مخصوص فالوونگ کی وجہ سے ایک طرح کے روحانی پیشوا کی حیثیت رکھتا ہے جس کا مقابلہ روایتی سیاسی پارٹیاں کرنے سے قاصر ہیں۔ لیکن عمران خان کے غائب ہوتے ہی یہ سیاسی فارمیشن تحلیل بھی ہو جائے گی۔

(128) 9 مئی کے واقعات فوج کی کھینچی ہوئی ریڈ لائن عبور کرنے کی مانند تھے۔ لیکن ان کی فوری روک تھام کی کوئی سنجیدہ کاوش نہیں کی گئی۔ اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں جن میں ایک بار

پھر ڈیپ سٹیٹ کی داخلی دھڑے بندی کا کردار بھی ہوسکتا ہے۔جس میں انہیں ڈر ہو کہ مظاہرین پر بڑا ریاستی جبر اس داخلی تقسیم کو کھلی پھوٹ میں بدل سکتا ہے۔یا پھر جبر کی صورت میں انہیں مظاہروں کے شدت اختیار کر جانے اور حالات کے مزید بگڑ جانے کا ڈر ہو۔بہر حال یہ بھی ممکن ہے کہ عمران خان کو قابو کرنے کے لئے انہیں جواز کی ضرورت ہو۔جس کے لئے فوجی وسول تنصیبات پر جلاؤ گھیراؤ کرنے والوں کو کچھ مہلت دے دی گئی ہو۔

(129) عمران خان کے ساتھ در پردہ مذاکرات بھی جاری ہیں۔لیکن اپنی مقبولیت کھو جانے کے ڈر سے وہ بڑی پسپائی یا شکست خوردگی پہ مبنی مصالحت کا کوئی اقدام اٹھانے سے گریزاں لگتا ہے۔دوسرے مقدمات کے علاوہ اس پر سائفر کا جو کیس ڈالا ہوا ہے اس میں موت تک کی سزا دی جاسکتی ہے۔تاہم اس انتہا پہ جانے سے شاید گریز ہی کیا جائے۔آنے والے عرصے میں بے شمار عوامل تعین کریں گے کہ عمران خان کیساتھ کیا ڈیل ہوتی ہے۔لیکن فی الوقت زیادہ امکانات یہی ہیں کہ اسے اقتدار سے باہر اور جیل کے اندر ہی رکھا جائے گا اور تحریک انصاف کو وفاقی و صوبائی اسمبلیوں میں بہت محدود کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

(130) ریاست کے لئے یہ انتہائی نازک صورتحال ہے۔جس میں غیر متوقع اقدامات بھی ممکن ہوسکتے ہیں۔

(131) ریاست بہر حال اس سیاسی انجینئرنگ میں بری طرح الجھی ہوئی ہے۔جس طرح سے مطلوبہ انتخابی نتائج حاصل کرنے کی کوشش جاری ہے وہ دھاندلی کے زمرے میں ہی آتی ہے۔جس سے یہ ساری صورتحال ایک دھماکہ خیز انداز سے پھٹ بھی سکتی ہے۔

(132) موجودہ حالات میں تو مارشل لا کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں لیکن کسی احتجاجی تحریک، معاشی بحران کی مزید شدت یا کسی اور طرح حالات کے بہت بگڑ جانے کی صورت میں یہ بالکل خارج از امکان بھی نہیں ہے۔اسی لئے اس نظام کے کچھ سنجیدہ تجزیہ نگاروں کی باتوں میں بھی اس کی بازگشت سنائی دے رہی ہے۔

(133) لیکن براہ راست فوجی مداخلت کی اپنی مشکلات اور پیچیدگیاں ہیں۔ بالخصوص ایسے حالات میں جب معیشت شدید خساروں اور قرضوں کا شکار ہے اور مہنگائی کرنا ہر حکومت کی مجبوری بن چکا ہے۔ فوج پہلے ہی اپنی ساکھ کے بحران سے دوچار ہے اور تحریک انصاف کی ایجی ٹیشن میں فوج مخالف آوازیں خود پنجاب کے اندر اٹھ رہی ہیں۔ ایسے میں آج کی فوجی قیادتوں کو پہلے والی اتھارٹی بھی نصیب نہیں ہے۔ لہٰذا مارشل لا ریاستی پالیسی سازوں کے لئے ایک آخری آپشن کا درجہ ہی رکھتا ہے۔

(134) مسئلہ یہ ہے کہ قوم پرستی سے لے کے بنیاد پرستی اور لبرل یا نیم لبرل رجحانات سے لے کے سنٹر لیفٹ تک، حکمران طبقے کی سیاست کی ہر پارٹی اسی سرمایہ دارانہ نظام پہ یقین رکھتی ہے اور اسی کی رکھوالی ہے۔ حتیٰ کہ اس نظام کے اندر کی پالیسیوں کے حوالے سے بھی عملاً ان میں کوئی خاص فرق یا اختلاف نہیں ہے۔ یہ نہ آئی ایم ایف اور امریکی سامراج کے سامنے نظریں اٹھا سکتے ہیں نہ اس ریاست کے آقاؤں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال سکتے ہیں۔ گماشتگی، کاسہ لیسی، بدعنوانی، منافقت، ضمیر فروشی اور موقع پرستی ان کے اندر رچی بسی ہوئی ہے۔ یہی ان کا تاریخی کردار ہے جو بدل نہیں سکتا۔

(135) ایسے میں محنت کش عوام کے تاریخی مفادات اور نصب العین کی نمائندہ اور نگہبان پارٹی اس سیاسی افق پہ موجود نہیں ہے۔ حتیٰ کہ اس وقت کوئی ایسا بائیں بازو کا اصلاح پسندانہ رجحان بھی موجود نہیں ہے جسے سنجیدگی سے لیا جا سکے۔ یہ ایک بہت بڑا سیاسی خلا ہے۔ لیکن محنت کش طبقے کے بڑے تحرک کے بغیر اسے پھر رجعتی قوتیں ہی پر کریں گی۔ چاہے وہ لبرل ہوں یا قدامت پسند۔

(136) اس سیاست کے متبادل کی تعمیر میں موضوعی و معروضی دونوں طرح کے عوامل کارفرما ہیں۔ لیکن معروضی حالات کا عمل دخل کئی گنا زیادہ ہے۔ آخری تجزیئے میں محنت کش طبقے کی تحریک کا فقدان ہی ایک انقلابی پارٹی کے فقدان کی کلیدی وجہ ہے۔ انقلابی تنظیموں کو آخر کار

طبقے کی تحریکوں کے طوفان ہی بڑی پارٹیوں کے طور پر ابھار کے سامنے لاتے ہیں۔

(137) طبقے کی نفسیات پر تاریخ اور روایات کا بوجھ مارکس کے بقول ہمالیہ جتنا بھاری ہوتا ہے۔ جسے وہ انقلابی تحریکوں کے دوران ہی حتمی طور پر اتار پھینک کر آگے کا سیاسی سفر شروع کرتا ہے۔لیکن اس وقت کی تیاری انقلابی تنظیموں کو بہت پہلے اور بہت مشکل وقتوں میں کرنا ہوتی ہے۔ جس کے لئے طبقاتی جدوجہد کی ہر صورت میں مداخلت کرنا پڑتی ہے اور اپنی نظریاتی سچائی، لگن، استقامت اور مستقل مزاجی سے محنت کشوں کا اعتماد جیتنا ہوتا ہے۔ یوں وہ تنظیمی بنیادیں استوار کرنا ہوتی ہیں جن پر آنے والے کل میں پارٹی کے دیوہیکل ڈھانچے کھڑے ہوسکیں۔ یہ کوئی آسان فریضہ یقیناً نہیں ہے۔لیکن اس کے علاوہ نجات کا کوئی راستہ بھی نہیں ہے۔

*****

(138) یہاں کی بورژوازی کی تاریخی تاخیر زدگی اور تکنیکی پسماندگی کے نتیجے میں پاکستان کی سرمایہ دارانہ معیشت روزِ اول سے بحرانات کا شکار اور سامراجی امداد و قرضوں کی محتاج رہی ہے۔اس دوران مختصر عرصے ایسے آئے ہیں جن میں معیشت نے بلند شرح نمو سے ترقی کی لیکن یہ عرصے بھی زیادہ تر سامراجی امداد اور گرانٹوں کے مرہون منت تھے۔

(139) مثلاً اپنی پچھلی تحریروں اور دستاویزات میں ہم نے تاریخی اعداد و شمار کی روشنی میں واضح کیا ہے کہ ایوب خان کے دور کی جس ترقی کا ڈھنڈورا یہاں کے بیشتر بورژوا معیشت دانوں کی طرف سے پیٹا جاتا ہے اس میں بڑے پیمانے کی امریکی امداد کا اہم کردار تھا جو اس پورے عرصے میں اربوں ڈالروں کی صورت میں زرِ مبادلہ کا اہم ماخذ رہی جس کے ذریعے یہاں مشینری اور خام مال کی بڑے پیمانے پر درآمد کے ذریعے صنعتکاری کا عمل آگے بڑھایا گیا۔

(140) ایوب دور کی صنعتی ترقی کا دوسرا اہم عامل معیشت میں گہری ریاستی مداخلت اور منصوبہ بندی تھی جس میں مغربی معاشی ماہرین کا کلیدی کردار تھا۔ایک زمانے میں تو پلاننگ کمیشن کی عمارت کا ایک پورا فلور ان ماہرین کے دفاتر کے لئے مختص تھا۔

(141) معیشت میں ریاستی مداخلت اور پلاننگ کی اس سامراجی پشت پناہی اور معاونت کے پیچھے ایک طرف تو اس دور میں عالمی سطح پر اپنایا جانے والا سرمایہ دارانہ معاشی ماڈل کارفرما تھا جس پر دوسری عالمی جنگ کے بعد مغرب میں ایک 'اتفاقِ رائے' (Consensus) موجود تھا اور جس پر کینیشیزم کی گہری چھاپ موجود تھی۔ یہ بنیادی طور پر ریاستی سرمایہ داری پر مبنی پالیسیاں تھیں جن میں ریاست نہ صرف انفراسٹرکچر بلکہ سروسز اور صنعت کے اہم شعبوں میں بھی سرمایہ کاری کرتی تھی۔ جس کے نتیجے میں ان شعبوں میں جزوی ریاستی ملکیت اور کنٹرول مغربی ممالک میں بھی ایک معمول تھا۔ اسی طرح ریگولیشن وغیرہ کے ذریعے بھی ریاستیں معیشتوں پر اثر انداز ہوتی تھیں۔ پاکستان جیسے سابق نوآبادیاتی اور پسماندہ خطوں کے حوالے سے بھی اس دور کے بورژوا ماہرین معیشت میں یہ سوچ حاوی تھی کہ یہاں ریاستی سرمایہ داری کے ذریعے ہی صنعتکاری کا عمل آگے بڑھ سکتا ہے۔

(142) لیکن ریاستی سرمایہ داری کی ان پالیسیوں کے تحت بھی بیشتر معیشتوں کے جی ڈی پی اور اثاثوں کی ملکیت میں نہ صرف نجی شعبے کی اکثریتی حصہ داری موجود تھی بلکہ معیشت میں ریاست کی مداخلت کا مقصد بھی سرمایہ داری کی ترویج اور استحکام ہی تھا۔ چنانچہ منصوبہ بندی کے جزوی عناصر کے باوجود ان معیشتوں کی نوعیت اور کردار سرمایہ دارانہ ہی تھا اور آخری تجزیئے میں یہ سرمایہ داری کی حرکت کے قوانین سے ماورا نہیں تھیں۔

(143) ہندوستان کا 'نہروویں سوشلزم' بھی اسی نوعیت کی معیشت تھی جو اگرچہ دنیا سے کافی حد تک کٹی ہوئی تھی لیکن جس کا بنیادی مقصد تاخیر زدہ قومی بورژوازی کو پروان چڑھانا ہی تھا۔ لیکن 1980ء کی دہائی میں 'لائسنس راج' کی انتہا پر بھی بھارتی جی ڈی پی، سرمایہ کاری اور روزگار وغیرہ میں نجی سیکٹر کا حصہ ریاست سے کہیں بڑا' بلکہ کئی گنا زیادہ تھا۔ یہی کیفیت اس دور میں برازیل، تنزانیہ اور کانگو جیسی انتہائی 'سٹیٹسٹ' (ریاست کا بظاہر گہرا عمل دخل رکھنے والی) سرمایہ دارانہ معیشتوں میں نظر آتی ہے۔

(144) اسی طرح ریاستی سرمایہ داری پر مبنی پالیسیوں کے باوجود اس دور کی مغربی معیشتوں میں بھی نجی سیکٹر ہی فیصلہ کن وزن اور اہمیت کا حامل تھا۔ مثلاً آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے اعداد و شمار کے مطابق 1960ء اور 1970ء کی دہائیوں میں فرانس، جو بہت 'سٹیٹسٹ' معیشت سمجھی جاتی تھی، کے جی ڈی پی میں ریاستی فرموں یا اداروں کا حصہ صرف 13 فیصد تھا۔ جبکہ جرمنی میں یہ 10 فیصد، اٹلی میں 7 فیصد اور برطانیہ میں 10 فیصد ہی تھا۔ امریکہ میں یہ اس سے بھی کہیں کم تھا۔

(145) یوں دوسری عالمی جنگ کے بعد سرمایہ داری کے اس 'سنہری دور' میں ریاستی ملکیت یا پلاننگ سے کہیں زیادہ اہم عنصر بلند شرح منافع کا تھا جس کے پیچھے بڑے پیمانے کی جنگی تباہی، جنگ کے دوران محنت کش طبقے کا دہرا تہرا استحصال، نئی ایجادات اور دریافتوں کے نتیجے میں جنم لینے والے نئے معاشی شعبے اور جنگ کے بعد تشکیل پانے والے نئے عالمی سیاسی منظر نامے وغیرہ جیسی وجوہات کارفرما تھیں۔ اسی بلند شرح منافع اور اس کے نتیجے جنم لینے والے سرمایہ کاری کے بوم کی وجہ سے یہ نظام بالخصوص مغرب میں بڑے پیمانے پر روزگار کی فراہمی، معیار زندگی میں اضافے، علاج و تعلیم وغیرہ کی مفت سہولیات اور محنت کش طبقے کی زندگیوں میں عمومی آسودگی کے ذریعے نام نہاد فلاحی ریاست قائم کرنے کے قابل ہوا۔

(146) لیکن اس دور میں سرمایہ داری کے پاس جہاں گنجائش موجود تھی وہاں اپنا ایک 'انسانی' چہرہ پیش کرنے کی کوشش اس کی بڑی مجبوری بھی تھی۔ جس کی وجہ پھر سوویت یونین، مشرقی یورپ، چین اور کیوبا وغیرہ میں ''سوشلزم'' (جو بنیادی طور پر سٹالنزم تھا) کی موجودگی تھی۔ ان مسخ شدہ مزدور ریاستوں میں منصوبہ بند معیشتوں کے تحت نسبتاً پسماندہ حالات میں ہی سہی لیکن محنت کش طبقات کو بڑی سہولیات ملی تھیں اور بڑے پیمانے کی صنعتکاری ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ اس دور میں مضبوط ٹریڈ یونینوں کے ساتھ ساتھ بائیں بازو کا رجحان رکھنے والی بڑی تحریکیں دنیا بھر میں موجود تھیں۔ لہٰذا ان حالات میں مغربی محنت کش طبقے کو مطمئن اور مجہول رکھنے کے لئے زندگی کو کسی حد

تک سہل بنانا سامراجی ریاستوں کے لئے ضروری بھی تھا۔

(147) آج کی ٹریڈ یونین اشرافیہ اور دوسرے اصلاح پسند جب دوسری عالمی جنگ کے بعد کی ریاستی سرمایہ داری کے سنہرے دور میں واپس جانے کے خواب دیکھتے ہیں تو وہ ان تاریخی عوامل کو سرے سے نظر انداز کر رہے ہوتے ہیں۔ لیکن انہی عوامل کے تحت مغربی سامراج نے نہ صرف اپنے خطوں میں محنت کش طبقات کے حق میں کچھ اصلاحات کیں بلکہ سوشلسٹ تحریکوں کا راستہ روکنے کے لئے دوسرے خطوں میں جدید سرمایہ داری کے جزیرے تعمیر کیے۔ اس سلسلے میں مشرقی ایشیا میں 'ایشین ٹائیگرز' (ہانگ کانگ، سنگاپور، جنوبی کوریا، تائیوان) کو وسیع اور تیز صنعتکاری کے ذریعے پروان چڑھایا گیا جو پھر ٹھوس ریاستی منصوبہ بندی اور مغربی سرمایہ کاری و امداد کی مرہون منت تھی۔

(148) پاکستان میں بھی ایوب خان کی آمریت کے جبر میں انہی پالیسیوں کو لاگو کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن پاکستان رقبے اور آبادی کے لحاظ سے 'ایشین ٹائیگرز' سے کئی گنا بڑا، ثقافتی طور پر انتہائی متنوع، سماجی طور پر کہیں زیادہ پیچیدہ اور معاشی طور پر خاصا پسماندہ ملک تھا۔ چنانچہ ایوب خان دور کی بلند معاشی شرح نمو کے باوجود یہاں نہ تو صنعتکاری کا عمل اس طرح سے استوار ہو سکا کہ دوررس بنیادوں پر آگے بڑھ سکے۔ اسی طرح انفراسٹرکچر کے کچھ دیوہیکل منصوبوں کے باوجود یہ معاشی ترقی اس معاشرے کی گہری پسماندگی کو مٹا کے ایک نسبتاً جدید معاشرہ قائم کرنے کے قابل بھی نہیں تھی۔ الٹا اس دور میں جو صنعتکاری ہوئی اس کے ثمرات حکمران طبقات کی بھی ایک قلیل پرت تک ہی محدود رہے جس کے نتیجے میں 22 خاندانوں کی اصطلاح زبان زدعام ہوئی جن کی ملکیت میں اس وقت کے 65 فیصد صنعتی اثاثے مرتکز تھے۔ ریاست بھی جو صنعتی یونٹ لگاتی رہی وہ چالو ہونے کے بعد سرمایہ داروں کے حوالے کیے جاتے رہے اور کسی سماجی فائدے کی بجائے نجی منافع خوری اور دولت کے اجتماع کا ذریعہ بنتے رہے۔ چنانچہ امارت اور غربت کی خلیج وسیع ہوتی گئی، طبقاتی تضادات شدت اختیار کرتے گئے اور آخرکار 69-1968ء کی انقلابی

تحریک کی صورت میں پھٹ پڑے۔

(149)اسی دوران سرمایہ دارانہ نظام عالمی سطح پر خود ایک گہرے بحران کا شکار ہو رہا تھا اور شرح منافع میں گراوٹ کے رجحان کے تحت ریاستی سرمایہ داری کا ماڈل ٹوٹ کے بکھر رہا تھا۔اس کی جگہ پر بورژوا معاشی دانش اور پالیسی کے میدانوں میں نیولبرلزم کے رجحانات سر اٹھا رہے تھے جو آزاد منڈی، ڈی ریگولیشن، نجکاری، سپلائی سائیڈ معاشیات اور معیشت میں ریاست کی کم سے کم مداخلت کے علمبردار تھے۔آج تک جاری یہ پالیسیاں تاریخی طور پر بحران زدہ سرمایہ داری کی جارحانہ روش کی غمازی کرتی ہیں۔

(150) بحران کا شکار سامراجی طاقتیں ایک طرف خود تنگی کا شکار تھیں اور ماضی کی طرح پسماندہ سرمایہ دارانہ ممالک کو بڑے پیمانے پر امداد دینے کا سلسلہ جاری رکھنے سے قاصر تھیں۔ علاوہ ازیں اپنے نیولبرل مرحلے میں داخل ہوتی سرمایہ داری محنت کش طبقے پر بھرپور سیاسی و معاشی حملوں کے لئے پر تول رہی تھی۔ برطانیہ میں مارگریٹ تھیچر اور امریکہ میں رونلڈ ریگن کی حکومتیں اس عمل کا واضح اظہار تھیں۔

(151) دوسری طرف سٹالنزم بھی ایک گہری ٹوٹ پھوٹ سے دوچار تھا جو بالآخر اس کے انہدام پر منتج ہوئی۔جس کے انتہائی منفی اثرات ناگزیر طور پر دنیا بھر میں مزدور تحریک اور بائیں بازو کی قوتوں پر مرتب ہوئے۔ان عوامل کے تحت طبقاتی جدوجہد جس پسپائی سے دوچار ہوئی اس کے اثرات کئی دہائیوں بعد آج تک محسوس کیے جا سکتے ہیں۔

(152)69-1968ء کی تحریک کے نتیجے میں ذوالفقار علی بھٹو نے جب اقتدار سنبھالا تو ایک طرف 1971ء کی جنگ نے معیشت کو گہرے بحران کا شکار کر رکھا تھا۔پھر عالمی سرمایہ داری خود ایک گہری زوال پذیری سے دوچار تھی۔اس عرصے میں پے در پے سیلاب بھی خاصی تباہی کا باعث بنے۔لیکن ان حالات سے ہٹ کے بھی بھٹو نے جو روش اختیار کی وہ ادھوری نیشنلائزیشن پر مبنی تھی جو ایک کرپٹ سرمایہ دارانہ ریاست کی مشینری کے تحت کی گئی تھی۔ یہ ناکافی اور تذبذب کا

شکار نیشنلائزیشن، جو کئی صورتوں میں نمائشی اہمیت کی ہی حامل تھی، یہاں سرمایہ داری کے خاتمے اور منصوبہ بند معیشت کی استواری کے قابل نہیں تھی۔ بیشتر صورتوں میں اداروں کو قومی ملکیت میں بھی لیے بغیر محض 'حکومتی کنٹرول' میں لینے پر اکتفا کیا گیا۔ ساتھ ہی سرمایہ دار طبقے کا 'اعتماد' بحال کرنے کی کوششیں اور آئی ایم ایف کے پروگرام بھی جاری رہے۔

(153) یوں بھٹو دور کی معاشی پالیسی بائیں بازو کی ایسی اصلاحات تک محدود ہو کے رہ گئی جن کی گنجائش پاکستان کی نحیف اور بحران زدہ سرمایہ داری میں سرے سے نہیں تھی۔ اس دوران کچھ اہم صنعتی اداروں کی بنیاد یقیناً رکھی گئی لیکن ریاست اور معیشت سمیت سرمایہ داری کے یکسر خاتمے کے بغیر یہ بہت ناکافی اقدامات تھے۔ اسی طرح لینڈ ریفارمز بھی نامکمل رہیں کیونکہ ریاست کی کرپٹ مشینری کی ملی بھگت سے بڑے زمیندار اپنی جاگیروں کو بچانے کے قابل تھے۔ بعد کے سالوں میں بھٹو حکومت کی مصالحت کی روش بڑھتی گئی جو رجعتی قوتوں کی حوصلہ افزائی اور بالآخر ضیاالحق کے اقتدار پر شب خون پر منتج ہوئی۔

(154) پاکستان میں نیولبرل طرز معیشت کی استواری کا جو سلسلہ ضیاالحق کے دور میں شروع ہوا اسے آنے والی جمہوری اور فوجی حکومتوں نے جاری و ساری رکھا۔ بالخصوص 90ء کی دہائی کے بعد اس عمل میں خاصی تیزی اور شدت آئی۔

(155) لیکن نیولبرلزم اگر ترقی یافتہ سرمایہ داری کی تاریخی گراوٹ کی غمازی کرتا ہے تو اس کے تحت پاکستان جیسی پسماندہ سرمایہ دارانہ معیشتوں کا بحران بھی شدید تر ہی ہوا ہے۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد کی دو یا تین دہائیوں میں ان معیشتوں میں ترقی کی کوئی گنجائش موجود بھی تھی تو آج وہ ناپید نظر آتی ہے۔ نتیجتاً یہاں صنعتکاری کا عمل تعطل کا شکار ہو کے ادھورا رہ گیا ہے اور فنانس اور سروسز سے وابستہ طفیلی شعبے پھیلاؤ کا شکار ہوئے ہیں۔

(156) یہ عمل ترقی یافتہ سرمایہ داری سے اس طرح مختلف ہے کہ مغربی معیشتیں صنعتکاری کے عروج پہ پہنچ کے نیولبرلزم کے تحت 'ڈی انڈسٹریلائزیشن' کا شکار ہوئی ہیں۔ جبکہ یہاں معیشت

میں صنعت کا حصہ زیادہ سے زیادہ 20 فیصد کے آس پاس ہی منڈلاتا رہا ہے۔ لیکن گزشتہ تقریباً ڈیڑھ دہائی سے یہ صنعتکاری بھی ایک بحران اور گراوٹ سے دوچار ہے جس میں آئی ایم ایف کے پروگراموں کا کلیدی کردار ہے۔ جبکہ سروسز کا شعبہ ایک بے ہنگم اور 'پری میچور' پھیلاؤ کا شکار ہو کے جی ڈی پی کے 50 فیصد سے بھی زیادہ ہو چکا ہے۔

(157) اسی صنعتی زوال پذیری کا ہی ایک نتیجہ ہے کہ جی ڈی پی میں برآمدات کا حصہ مسلسل گرتے ہوئے 1990ء میں 16 فیصد سے 2020ء میں 10 فیصد پہ آ چکا ہے۔ جس کی وجہ سے کرنٹ اکاؤنٹ خسارے کا مسئلہ سنگین ہوتا گیا ہے۔ ایسے میں بیرون ملک مقیم پاکستانیوں کے ترسیلاتِ زر ہی ہیں جن سے کرنٹ اکاؤنٹ کو کچھ سہارا ملتا ہے۔ لیکن اس کی بھاری قیمت بھی ہنرمند لیبر کی ملک سے ہجرت کی صورت میں چکانی پڑتی ہے۔

(158) 1980ء کی دہائی سے آج تک ہر کلیدی اشاریہ (بشمول سرمایہ کاری کی شرح، ترقیاتی اخراجات، ٹیکس آمدن، معاشی شرح نمو (گروتھ ریٹ)، کرنٹ اکاؤنٹ بیلنس، حکومتی قرضہ وغیرہ) معیشت کی زوال پذیری کی غمازی ہی کرتا ہے۔ معیشت کی اس بحرانی کیفیت کے ساتھ یہاں کوئی ترقی یافتہ معاشرہ پروان نہیں چڑھ سکتا۔

(159) پاکستان نے 75 سالوں میں آئی ایم ایف سے 23 بیل آؤٹ لیے ہیں۔ ملکی تاریخ میں ذوالفقار علی بھٹو کے اقتدار سمیت ہر فوجی و جمہوری حکومت نہ صرف آئی ایم ایف کے پاس جانے پہ مجبور ہوئی ہے بلکہ کئی حکومتوں کو ایک سے زیادہ بار آئی ایم ایف کے پروگراموں میں جانا پڑا ہے۔ جبکہ ان میں سے ہر حکومت معیشت کی مستقل بحالی، ملکی سالمیت اور کشکول توڑنے جیسے پرفریب وعدوں پر برسر اقتدار آئی ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ معاشی بحران کوئی انتظامی مسئلہ نہیں ہے بلکہ پاکستانی سرمایہ داری کے خمیر میں موجود ناقابل حد تضادات کی ناگزیر پیداوار ہے۔

(160) پاکستانی معیشت مسلسل داخلی و خارجی خساروں سے دوچار رہی ہے جس کی بنیادی وجہ پھر پاکستانی ریاست کی تاریخی طور پر کمزور معاشی بنیادیں ہیں۔ جو نہ تکنیکی طور پر گہری

ہیں نہ پیداواری حوالے سے وسیع ہیں لیکن جن کے اوپر مخصوص تاریخی حالات میں ایک وزنی اور دیوہیکل سیاسی وسماجی سپرسٹرکچر کھڑا ہو گیا ہے۔ نتیجتاً یہ پورا سرمایہ دارانہ ڈھانچہ مسلسل معاشی، سیاسی اور سماجی بحرانوں میں ہچکولے کھاتا رہتا ہے۔

(161) آئی ایم ایف جیسے سامراجی اداروں کی پالیسیاں یا 'سٹرکچرل اصلاحات' بھی معاشی بنیادوں کو مستحکم کرنے کی بجائے ان کے اوپر کھڑی سیاسی وسماجی عمارت کے مختلف حصوں کو منہدم کر کے بوجھ ہلکا کرنے کی کوششوں پر ہی مبنی ہوتی ہیں۔ یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ معاشی ترقی یا سماجی استحکام ان اداروں کا مطمع نظر ہرگز نہیں ہوتا بلکہ یہ معیشت کو دیوالیے سے بچانے کی ایسی پالیسیاں نافذ کرتے ہیں جو نہ صرف فوری طور پر محنت کش طبقات کی زندگیاں اجیرن کر دیتی ہیں بلکہ لمبے عرصے میں معاشی بحران میں اضافے کا ہی باعث بنتی ہیں۔

(162) آئی ایم ایف کے حالیہ پروگرام نے بھی اگرچہ دیوالیے کا خطرہ فی الوقت ٹال دیا ہے لیکن لمبے عرصے میں معیشت کا کوئی مسئلہ حل نہیں ہوا ہے۔ ہمیشہ کی طرح بحران کی ساری قیمت محنت کش عوام پر مہنگائی اور بیروزگاری کی صورت میں منتقل کر دی گئی ہے۔

(163) افراطِ زر کو کنٹرول کرنے کے لئے شرح سود میں ہوشربا اضافہ کیا گیا ہے جس سے یہ 22 فیصد تک پہنچ چکی ہے۔ لیکن مہنگائی ابھی تک 40 فیصد کے آس پاس منڈلا رہی ہے۔ جبکہ عوام پر اس کا حقیقی بوجھ سرکاری اعداد و شمار سے کہیں زیادہ ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ مہنگائی کو کنٹرول کرنے کا یہ نیولبرل نسخہ زیادہ کارگر ثابت نہیں ہو سکا ہے۔ الٹا اس سے سرمایہ کاری مزید سکڑ گئی ہے جس سے معیشت کی شرح نمو کم و بیش منجمد ہو کے رہ گئی ہے۔ علاوہ ازیں ریاستی قرضوں کا بوجھ بھی بہت بڑھ گیا ہے۔

(164) حاوی معاشی سوچ اور تجزیوں کے برعکس یہ کوئی کلاسیکی کینیشین افراطِ زر نہیں ہے جو معاشی سرگرمیوں (سرمایہ کاری اور کھپت) کے عروج پر پہنچ جانے سے جنم لیتا ہے اور جسے شرح سود میں اضافے کے ذریعے کنٹرول کیا جا سکتا ہے بلکہ ایک طرح کا سپلائی سائیڈ افراطِ زر ہے جس

کی وجوہات میں روپے کی قدر میں کمی، بالواسطہ ٹیکسوں اور قیمتوں میں اضافے کی وجہ سے گیس، بجلی اور تیل وغیرہ کی مہنگائی، عالمی سطح پر مہنگے تیل سمیت افراطِ زر کا عمومی رجحان، پیداواری شعبے کی کمزوری، معیشت کا عمومی عدم استحکام اور سیاسی و معاشی طور پر غیر یقینی صورتحال شامل ہیں۔

(165) بجلی اور گیس کی قیمتوں میں مسلسل اضافوں کے باوجود گردشی قرضہ بڑھ ہی رہا ہے۔ توانائی کے شعبے کا کل گردشی قرضہ 4.5 ٹریلین روپے تک پہنچ چکا ہے جس میں 2.3 ٹریلین بجلی جبکہ 2.1 ٹریلین گیس کے شعبے کا قرضہ ہے۔ بالخصوص بجلی کے شعبے میں یہ گردشی قرضے ہزاروں ارب روپے ہر سال عوام کی جیبوں سے آئی پی پیز کی طرف منتقل کرنے کا ذریعہ بن چکے ہیں۔ کے الیکٹرک کو ریاست کی جانب سے دی جانے والی سینکڑوں ارب روپے کی 'سبسڈی' اس کے علاوہ ہے۔ اس وقت ڈیڑھ سے دو ہزار ارب روپے سالانہ بجلی کی پیداوار کے نجی شعبے کو صرف ''کیپیسٹی پیمنٹس'' (یعنی وہ پیداواری صلاحیت جو استعمال ہی نہیں ہوئی) کی مد میں ادا کیا جا رہا ہے۔ یہ ادائیگیاں بھی ڈالروں میں کرنی ہوتی ہیں اور روپے کی قدر میں کمی سے ان میں اضافہ ہی ہوتا ہے۔ جس کے لئے پھر بلوں میں بنیادی ٹیرف سمیت مختلف مدوں میں آئے روز اضافہ کیا جاتا ہے۔

(166) اس لوٹ مار کا آغاز بھی ورلڈ بینک نے یہاں 1980ء اور 90ء کی دہائیوں میں کروایا تھا جس کے بعد ہر جمہوری اور فوجی حکومت نے اسے جاری رکھنے کی پالیسیاں اپنائی ہیں۔ حالیہ مہینوں میں اس حوالے سے خود بورژوا میڈیا اور سیاست میں بھی خاصی بحث ہوتی رہی ہے۔ اس سے پہلے عمران خان کے دورِ حکومت میں بھی آئی پی پیز سے نئے اور زیادہ منصفانہ معاہدے کرنے کا شوشا چھوڑا گیا تھا۔ لیکن سرمایہ دارانہ حلقوں میں اٹھنے والی ایسی آوازوں کی وجہ پھر یہ ہے کہ خود بورژوازی کا ایک بڑا حصہ بجلی کی مہنگائی کی وجہ سے شدید متاثر ہوتا ہے۔ جس میں بالخصوص صنعت سے وابستہ سرمایہ دار شامل ہیں۔ لیکن دوسری طرف ان آئی پی پیز سے جڑی سامراجی کمپنیوں (بشمول چین) اور مقامی بورژوازی کے ایک زیادہ طاقتور حصے کے مفادات کے سامنے حکومتیں بالکل بے بس اور خصی نظر آتی ہیں۔ علاوہ ازیں اس ڈاکہ زنی میں خود ریاستی و سیاسی

اشرافیہ کے کمیشن اور حصہ داری بھی شامل ہے۔ یوں ایک انتہائی طاقتور مافیا تشکیل پاتا ہے جو ملکی دولت کا بڑا حصہ ہڑپ کرتا جا رہا ہے۔

(167) پچھلے ایک ڈیڑھ سال کے دوران بجلی اور گیس کے بل کم از کم دو سے تین گنا ہو چکے ہیں۔ اس وقت چھوٹے کاروباروں کو بجلی کا ایک یونٹ عملاً سو روپے میں پڑ رہا ہے۔ توانائی کی یہ مہنگائی، جو آنے والے عرصے میں بھی جاری ہی رہے گی، ایک طرف ملک کے اندر ہر چیز کی قیمت میں اضافے کا باعث ہے۔ دوسری طرف اس سے پاکستانی مصنوعات کی عالمی منڈی میں مقابلے کی سکت مزید کمی کا شکار ہی ہوگی جس سے تجارتی اور کرنٹ اکاؤنٹ خسارے مزید بڑھیں گے۔ اس صورتحال کو 22 فیصد کی ہوشربا شرح سود کے ساتھ ملا کے دیکھیں تو ملکی صنعت کی مزید بربادی کا پیش منظر واضح ہو جاتا ہے۔

(168) اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ مائیکرو اکانومی کی جس بربادی کی قیمت پر میکرو اکانومی کو ٹھیک کرنے کی کوشش کی جاتی ہے وہ لمبے عرصے میں میکرو اکنامک اشاریوں میں مزید بگاڑ کا باعث ہی بنتی ہے۔ یوں آئی ایم ایف کی پالیسیاں ایک وقتی اور معاشی و سماجی طور پر نقصان دہ جگاڑ بن کے رہ جاتی ہیں۔

(169) روپے کی قدر کو منڈی پر چھوڑ کر گرانے کے پیچھے آئی ایم ایف کی یہ سوچ کارفرما ہوتی ہے کہ اس سے درآمدات میں کمی ہوگی جبکہ برآمدات بڑھیں گی جس سے تجارتی اور کرنٹ اکاؤنٹ خسارہ کم ہو جائے گا۔ لیکن پاکستان جیسے ممالک میں یہ فارمولا بھی تاریخی طور پر ناکام رہا ہے۔ پچھلے تقریباً دس سالوں میں ڈالر 100 روپے سے بڑھ کر 280 روپے پہ پہنچ چکا ہے۔ پچھلے صرف ایک سال میں روپے کی قدر میں 20 فیصد کمی ہوئی ہے۔ لیکن اس دوران برآمدات میں کوئی بڑا اضافہ نہیں ہو پایا ہے۔

(170) لیکن اس پالیسی سے درآمدات کی قیمتوں میں اضافے سے خام مال اور مشینری وغیرہ مہنگی ہو جاتی ہے جس سے صنعت بری طرح متاثر ہوتی ہے۔ دوسری طرف درآمدات میں

شامل عام استعمال کی اشیا کی قیمتیں بڑھنے سے مہنگائی کی شرح بھی بڑھ جاتی ہے جس سے کھپت کم ہو جاتی ہے۔اس سے وقتی طور پر تجارتی خسارہ تو کم ہوسکتا ہے لیکن ساتھ ہی درآمدات پر گہرا انحصار رکھنے والی پاکستان جیسی معیشتوں کی شرح نمو بھی بری طرح گر جاتی ہے۔

(171) پچھلی کچھ دہائیوں میں ملکی معیشت کا دارومدار درآمدات پر اس قدر بڑھتا گیا ہے کہ پاکستان اب صارفین کا ملک بن چکا ہے جو خود کچھ خاص پیدا نہیں کرتا۔ یہ کیفیت ہمیں یہاں کے سرمایہ دار طبقے کے بدلتے ہوئے معاشی کردار میں بھی نظر آتی ہے جو فیکٹریاں اور صنعتیں لگانے سے زیادہ اب رئیل اسٹیٹ، سٹاک مارکیٹ اور ریٹیل جیسے غیر پیداواری شعبوں میں ہی پیسہ لگاتا ہے۔ صنعتی یونٹ بند کر کے وہاں شاپنگ مالوں یا بیرونی مصنوعات کے گوداموں کی تعمیر بڑے شہروں میں ایک معمول بن چکا ہے۔لیکن ایسے میں جب تجارتی خسارے کو کنٹرول کرنے کے لئے برآمدات کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے تو معیشت بری طرح بیٹھ جاتی ہے۔

(172) آئی ایم ایف کے نسخوں سے جڑے مذکورہ بالا عوامل کے تحت ہی معیشت کی شرح نمو میں شدید کمی آئی ہے۔ پچھلے مالی سال کے دوران شرح نمو کو بڑی مشکل سے کھینچ تان کے سرکاری اعداد و شمار میں 0.29 فیصد دکھایا گیا تھا۔ جبکہ جاری مالی سال کے دوران بھی شرح نمو کا اندازہ 2 فیصد کے آس پاس ہی لگایا جا رہا ہے۔ آبادی میں اضافے کو مدنظر رکھیں تو یہ کیفیت معاشی سکڑاؤ کے زمرے میں ہی آتی ہے۔

(173) بلند افراط زر (مہنگائی) کا انتہائی کم شرح نمو یا معاشی جمود کے ساتھ یہ ملاپ سٹیگفلیشن کی انتہائی تکلیف دہ معاشی صورت کو جنم دے رہا ہے جس کے آثار عمران خان کے دور حکومت میں ہی ظاہر ہونے لگے تھے لیکن جو وقت کے ساتھ شدید ہوتی گئی ہے۔ اس کا آسان الفاظ میں مطلب لوگوں کی آمدن، کھپت، روزگار اور معیارِ زندگی میں بڑی گراوٹ ہے۔

(174) ایک طرف روپے کی قدر میں کمی اور دوسری طرف معاشی جمود کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ پچھلے پانچ سالوں سے ڈالروں میں ملک کا جی ڈی پی بھی کم و بیش منجمد ہے۔ جبکہ اسی عرصے

میں فی کس جی ڈی پی اضافے کی بجائے الٹا کمی کا شکار ہوا ہے۔اس وقت پاکستان کی فی کس اوسط آمدن صرف 1500 ڈالر سالانہ ہے جو ہندوستان اور بنگلہ دیش کے تقریباً 2500 ڈالر سے بھی کم ہے۔ یہ صورتحال نہ صرف گہرے معاشی بحران بلکہ مسلسل بڑھتی ہوئی سماجی تنگی اور بدحالی کی غمازی بھی کرتی ہے۔

(175) آئی ایم ایف کے پروگرام میں مالیاتی خسارے کو کم کرنے کے لئے آسٹیریٹی کے سخت پالیسیاں لاگو کی گئی ہیں لیکن اب تک کے حالات یہی بتا رہے ہیں کہ جاری مالی سال میں بھی خسارے میں خاطر خواہ کمی نہیں ہو پائے گی۔اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ شرح سود میں اضافے کی وجہ سے حکومت کو قرضوں پر بھاری سود ادا کرنا پڑ رہا ہے۔ یاد رہے کہ قرضے کی موجودہ سطح اور ترکیب کیساتھ شرح سود میں ایک فیصد اضافہ سود کی مد میں ادائیگیوں کو 600 ارب روپے بڑھا دیتا ہے۔

(176) اس تناظر میں مالیاتی خسارہ 8.2 ٹریلین روپے یا جی ڈی پی کا 7.6 فیصد رہنے کا امکان ہے۔ 'فسکل مانیٹر' کی رپورٹ کے مطابق حکومت کی آمدن تقریباً 13 ٹریلین روپے رہے گی جو جی ڈی پی کا 12 فیصد بنتا ہے۔لیکن اس آمدن کا 70 سے 80 فیصد پرانے قرضوں پر سود کی ادائیگی کی نذر ہو جائے گا۔اس حوالے سے خود حکومت کا خیال ہے کہ 8.5 ٹریلین روپے 'ڈیٹ سروسنگ' کی نذر ہوں گے۔ تاہم حقیقی رقم اس سے زیادہ ہوگی۔جبکہ مجموعی اخراجات کا تخمینہ تقریباً 21 ٹریلین روپے (جی ڈی پی کا 20 فیصد) لگایا گیا ہے۔ یوں آمدن اور اخراجات کے بیچ میں بڑی خلیج موجود ہے۔اس مساوات میں تقریباً دو ہزار ارب روپے کے اعلانیہ ''دفاعی اخراجات'' کو بھی شامل کر لیں تو صورتحال کی سنگینی اور بھی واضح ہو جاتی ہے۔

(177) یہاں یہ نکتہ بھی مدنظر رہنا چاہئے کہ یہ ایک طرح کا بحرانی خسارہ ہے اور ان بجٹ یا مالیاتی خساروں سے مختلف بلکہ متضاد نوعیت کا حامل ہے جو حکومتیں معمول کے حالات میں معیشتوں کے پھیلاؤ کے لئے استعمال کرتی ہیں۔

(178) اس بے قابو خسارے کے نتیجے میں بینکوں کے تقریباً 75 فیصد قرضوں کا رخ حکومت کی طرف ہے جس کی وجہ سے نجی شعبے کے لئے قرضہ حاصل کرنے کی گنجائش بہت کم ہوگئی ہے۔ جس کا ناگزیر نتیجہ سرمایہ کاری میں مزید گراوٹ ہے۔ پاکستان میں مستقل اثاثوں میں سرمایہ کاری کی شرح ویسے ہی بہت کم ہے اور مسلسل گراوٹ کے ساتھ اس وقت جی ڈی پی کے 14 فیصد پر کھڑی ہے۔ اس کے مقابلے میں ہندوستان میں یہ 29 فیصد، بنگلہ دیش میں 31 فیصد جبکہ چین میں 40 فیصد سے بھی زیادہ ہے۔

(179) پیداواری سرمایہ کاری کے فقدان سے کم پیداواریت (Productivity) کا مسئلہ بھی جنم لیتا ہے جس کے نتیجے میں برآمدی اجناس کی لاگت بڑھتی ہے اور وہ بین الاقوامی منڈی میں مقابلہ بازی کی سکت کھو دیتی ہیں۔ نتیجتاً تجارتی توازن کا بگاڑ اور خسارہ جنم لیتا ہے۔ جبکہ داخلی طور پر معیشت ایک قلت اور غربت کے گھن چکر میں جکڑی رہتی ہے۔

(180) اس کی بنیادی وجہ پھر نیولبرل معاشیات کے تحت سٹہ بازی پر مبنی غیر پیداواری شعبوں کا پھیلاؤ ہے جس میں رئیل اسٹیٹ سرفہرست ہے۔ یہ شعبے کم وقت میں بڑے منافعوں کا ذریعہ بن کے پیداواری شعبوں میں سرمایہ کاری کے قحط کو جنم دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ بے ہنگم قسم کی ہاؤسنگ سوسائٹیوں کے ذریعے قیمتی زرعی زمینوں کا ضیاع صنعت کے ساتھ ساتھ زراعت کو بھی بھاری نقصان پہنچا رہا ہے۔

(181) اسی طرح سٹاک مارکیٹ ہے جو آج کل نئی بلندیوں کو چھو رہی ہے اور بڑے سٹہ باز خوب مال بنا رہے ہیں۔ اس میں آئی ایم ایف سے ڈیل کے نتیجے میں معاشی منظرنامے میں کچھ 'کلیریٹی' کے ساتھ ساتھ شرح سود اور روپے کی قدر میں کچھ استحکام (جسے وقتی ٹھہراؤ کہنا زیادہ بہتر ہوگا)، نواز شریف کے ساتھ ریاست کی مبینہ ڈیل اور عمران خان کی مسلسل ایجی ٹیشن سے جنم لینے والے سیاسی انتشار میں جزوی کمی کا بھی کردار موجود ہے۔ علاوہ ازیں ریاست کے طاقتور حلقوں کی جانب سے سرمایہ داروں کو آنے والے عرصے میں بڑی بیرونی سرمایہ کاری کے خواب بھی

دکھائے گئے ہیں۔

(182) لیکن سٹاک مارکیٹ انڈیکس کے ابھار میں بھی کلیدی کردار بینکوں اور توانائی کمپنیوں کے حصص کا ہے۔ مثلاً جولائی سے ستمبر تک ٹیکس ادائیگیوں کے بعد بینکوں نے 149 ارب روپے کا نیٹ منافع کمایا۔ ان منافعوں میں بڑا کردار پھر ریاست کا ہے جو بھاری شرح سود پر بینکوں سے دھڑا دھڑ قرضہ اٹھا رہی ہے۔ اسی طرح توانائی کی مارکیٹنگ کمپنیوں نے 30 ارب روپے کا خالص منافع کمایا جس میں عالمی سطح پر توانائی کی قیمتوں میں اضافے اور پچھلے عرصے میں روپے کی قدر میں کمی کا اہم کردار ہے۔

(183) بحیثیت مجموعی سٹاک مارکیٹ کی اس ترقی کا معیشت کی حقیقی صورتحال بالخصوص وسیع تر عوام کے حالات زندگی سے کم ہی تعلق ہے۔ یہ سرمائے کے بڑے جغادریوں کا کھیل ہے جو سٹاک مارکیٹ کو اٹھا کے بھی کماتے ہیں اور گرا کے بھی کماتے ہیں۔ علاوہ ازیں حصص جس طرح چڑھ رہے ہیں اسی طرح واپس بھی گر سکتے ہیں۔ جیسا کہ نواز شریف دور کے آخری عرصے میں ہو چکا ہے۔

(184) جہاں تک بیرونی خسارے، جو اپنا حتمی اظہار کرنٹ اکاؤنٹ خسارے کی صورت میں کرتا ہے، کا سوال ہے تو روپے کی قدر میں بڑی کمی کے ذریعے اسے وقتی طور پر کنٹرول تو کر لیا گیا ہے لیکن جیسا کہ پہلے وضاحت کی گئی ہے کہ ایسا معاشی نمو میں شدید کمی بلکہ سکڑاؤ کی قیمت پر ممکن ہوا ہے۔ پاکستان جیسے درآمدات پر مبنی ممالک میں کرنٹ اکاؤنٹ خسارے کا معاشی نمو سے گہرا تعلق ہے اور معیشت کا گلا گھونٹ کر آئی ایم ایف کے پروگراموں میں کرنٹ اکاؤنٹ میں بہتری لائی جاتی ہے۔ لیکن جونہی معیشت کچھ نمو کا مظاہرہ کرنے لگتی ہے یہ مسئلہ پھر سر اٹھانے لگتا ہے۔ موجودہ معاشی ماڈل کے تحت بالعموم 5 فیصد کی شرح نمو سے آگے کرنٹ اکاؤنٹ کا بگاڑ بے قابو ہونے لگتا ہے۔

(185) لیکن کرنٹ اکاؤنٹ خسارے میں وقتی بہتری یا سرپلس کے باوجود آنے والے

دنوں میں صورتحال کچھ زیادہ بہتر معلوم نہیں ہوتی۔ جس کی وجہ بیرونی قرضوں کی مد میں بڑی ادائیگیوں کا واجب الادا ہونا ہے۔ مثلاً ایک امریکی تھنک ٹینک (یو ایس آئی پی) کی اپریل 2023ء کی رپورٹ کے مطابق 2026ء تک پاکستان کو 77 ارب ڈالر کی ادائیگیاں کرنی ہیں۔ جبکہ صرف جاری مالی سال میں 25 ارب ڈالر واجب الادا ہیں۔ اس سلسلے میں پرانے قرضوں کو رول اوور کروانے کی کوششیں یقیناً کی جائیں گی لیکن اس کے باوجود کرنٹ اکاؤنٹ میں بڑا شگاف موجود رہے گا جسے پر کرنے کے لئے نئے قرضے لیے جائیں گے۔ جو ایک اندازے کے مطابق 6 سے 7 ارب ڈالر ہو سکتے ہیں۔

(186) ایسے میں معیشت کی صحت کا اندازہ سٹیٹ بینک کے پاس موجود زرِ مبادلہ کے ذخائر سے بھی لگایا جا سکتا ہے جنہیں مانگ تانگ کے بڑی مشکل سے 8 ارب ڈالر پہ پہنچایا گیا ہے لیکن جو بمشکل دو ماہ کی درآمدات کے لئے ہی کافی ہیں۔ جبکہ قلیل مدت میں بیرونی قرضوں کی ادائیگی کے لئے ان ذخائر سے 2.8 گنا زائد رقم چاہئے۔

(187) ان داخلی و بیرونی خساروں کے نتیجے میں آئی ایم ایف کے پروگرام میں ہونے کے باوجود قرضوں کا پہاڑ بلند ہوتا جا رہا ہے۔ پچھلے صرف ایک مالی سال کے دوران مجموعی حکومتی قرضے اور واجبات 17 ٹریلین روپے یا 29 فیصد کے اضافے کے ساتھ 77 ٹریلین روپے سے زیادہ ہو چکے ہیں جو جی ڈی پی کا 91 فیصد بنتا ہے۔ قرضوں اور واجبات کا جی ڈی پی کے ساتھ یہ تناسب 2013ء میں 70 فیصد جبکہ 2008ء میں 65 فیصد تھا۔ اس وقت حکومت روزانہ اوسطاً 44 ارب روپے قرضہ لے رہی ہے۔ ماہر معیشت فرخ سلیم کے مطابق عمران خان کے دورِ حکومت میں یہ رقم 17 ارب جبکہ اس سے پہلے نواز شریف کے دورِ حکومت میں 8 ارب تھی۔ جبکہ پیپلز پارٹی نے اپنے دورِ حکومت میں قرضوں میں ہر روز 5 ارب روپے کا اضافہ کیا۔ یہ تمام اعداد و شمار لمبے عرصے میں معاشی بحران کی شدت میں اضافے کی واضح نشاندہی کرتے ہیں۔

(188) واجبات سے ہٹ کر صرف قرض کی بات کریں تو پی ڈی ایم حکومت اور نگران

سیٹ اپ نے قرضوں میں 12 ٹریلین روپے سے زائد کا اضافہ کیا ہے۔ مجموعی قرضے اس وقت 63 ٹریلین روپے سے تجاوز کر چکے ہیں جن میں سے 40 ٹریلین داخلی جبکہ تقریباً 22 ٹریلین بیرونی قرض ہے۔

(189) ان حقائق کی روشنی میں دیکھا جائے تو مستقبل کے معاشی منظرنامے کی عمومی پیش بینی کی جاسکتی ہے۔ جس میں حکومتوں کے آنے جانے سے قطع نظر پاکستان کو آنے والے سالوں میں بھی مسلسل آئی ایم ایف کے پروگراموں میں رہنا پڑے گا۔ اس کا ناگزیر مطلب یہی ہے کہ حکومت کوئی بھی ہو، آسٹیریٹی، نجکاری، مہنگائی اور بیروزگاری کی پالیسیاں اس ملک کے عوام پہ ایک آسیب کی طرح منڈلاتی رہیں گی۔

(190) نجکاری کے مسئلے کی بات بالخصوص پی آئی اے، سٹیل مل اور ریلوے وغیرہ کے تناظر میں کریں تو ان اداروں کی تعمیر یا توسیع ایک مختلف معاشی کردار کے حامل عہد میں ریاستی سرمایہ داری کی پالیسیوں کے تحت کی گئی تھی۔ جس کا جائزہ ہم نے اوپر لیا ہے۔ لیکن انہیں ریاستی ملکیت میں چلانا موجودہ نیولبرل ماڈل کے تقاضوں سے بالکل متضاد عمل ہے۔ نہ تو اس نظام کی نااہل اور کرپٹ حکومتوں میں انہیں ایک شفاف انداز سے چلانے کی نیت، صلاحیت اور ارادہ موجود ہے۔ نہ اتنی معاشی گنجائش ہے کہ کچھ بڑی ریاستی انٹرپرائزز کو فلاحِ عامہ اور معیشت کے مجموعی مفاد کے تحت خسارے میں چلایا جاسکے۔ یوں آج کی سرمایہ داری میں ان کی بحالی کے امکانات کم وبیش ناپید ہو چکے ہیں۔

(191) لیکن ان کی نجکاری بھی اتنی آسان نہیں ہے۔ سرمایہ دارانہ ریاست نے جن مقاصد کے تحت انہیں کھڑا کیا تھا ان کا حامل نجی شعبہ یا سرمایہ دار نہیں ہوسکتا۔ ویسے بھی نجی شعبہ کبھی بھی اتنے بڑے پیمانے اور طویل مدتوں کے منصوبوں میں سرمایہ کاری نہیں کرتا۔ اسے پبلک پرائیویٹ شراکت کی شکل میں بھاری ریاستی ضمانتیں دے کے ہی راغب کرنا پڑتا ہیں۔ چنانچہ ان اداروں کو پھر چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹ کے بیچنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن یہ کوششیں بھی

زیادہ کامیاب نہیں ہو پائی ہیں۔ یا پھر ایسی لوٹ سیل لگائی جاتی ہے کہ انہیں کوڑیوں کے بھاؤ نجی شعبے کے حوالے کر دیا جائے۔ جو پھر ان کے قیمتی اثاثوں کو نوچ سکے۔ ایسا ہی ایک حملہ بجلی کی ڈسٹری بیوشن کمپنیوں پر کرنے کے لئے دوبارہ سے پر تولے جا رہے ہیں۔

(192) محنت کشوں کے لئے نجکاری بہر صورت بیروزگاری، ڈاؤن سائزنگ، مہنگائی، اجرتوں میں کمی اور سہولیات و مراعات کے خاتمے کی شکل میں بربادی کا ہی نسخہ ہے۔ لہٰذا اس کی ہر شکل کے خلاف بھرپور جدوجہد کی ضرورت ہے۔ لیکن نجکاری کے خلاف لڑائی کو اگر سرمایہ داری کے خاتمے کے انقلابی پروگرام سے نہ جوڑا جائے تو یہ نظریاتی طور پر بالکل دیوالیہ اور خصی ہو جاتی ہے۔

(193) معیشت کے ان حالات میں صحت، تعلیم و ترقیاتی امور پر حکومتی اخراجات نہ صرف ناکافی بلکہ شرمناک ہی رہیں گے جس کے نتیجے میں انفراسٹرکچر کی زبوں حالی اور عوام کی بنیادی ضروریات زندگی سے محرومی میں اضافہ ہی ہوگا۔ جس ملک میں صحت اور تعلیم پر جی ڈی پی کا تین فیصد بھی ریاست خرچ نہ کرتی ہو وہاں ایک تندرست، پڑھی لکھی اور ہنرمند لیبر فورس کبھی پیدا نہیں ہو سکتی۔ ایسے معاشرے پھر غربت، قلت اور محتاجی میں ہی سلگتے رہتے ہیں۔ جب تک کہ انقلابی طریقوں سے ان کی کایا نہ پلٹی جائے۔

(194) لیکن ان سرکاری اعداد و شمار سے ہٹ کے بھی پاکستانی معیشت کا ایک پہلو ہے جسے تناظر کی تخلیق میں مدنظر رکھنا لازم ہے۔ یہ اس ملک کی دیوہیکل غیر دستاویزی، سیاہ، انفارمل یا 'شیڈو' معیشت ہے جو معاشی سرگرمی اور روزگار کا ایک بہت بڑا ماخذ ہے اور جس پر دستاویزی معیشت کا گہرا انحصار موجود ہے۔

(195) پاکستان میں غیر دستاویزی معیشت کے حجم کے حوالے سے وثوق سے بات کرنا محال ہے۔ مثلاً نیشنل بینک کی ایک رپورٹ کے مطابق اس کا حجم جی ڈی پی کے 30 فیصد سے 90 فیصد تک ہو سکتا ہے۔ موخر الذکر صورت کا مطلب ہے کہ معیشت کا جتنا حجم حکومتی اعداد و شمار میں نظر آتا ہے حقیقت میں اس سے تقریباً دوگنا ہے۔ اسی طرح ملک کی اوسط فی کس آمدن بھی حکومتی

کھاتوں سے کہیں زیادہ ہے۔ تاہم عین ممکن ہے کہ غیر دستاویزی معیشت مذکورہ بالا اندازوں سے بھی کہیں بڑے حجم کی حامل ہو۔

(196) سرکاری ریکارڈ، ریگولیشن اور ٹیکسیشن سے ماورا معیشت کا یہ سیاہ حصہ قانونی و غیر قانونی' دونوں طرح کی معاشی سرگرمیوں پر مشتمل ہے اور حالیہ دہائیوں میں اس کے پھیلاؤ کی شرح دستاویزی معیشت سے کہیں زیادہ رہی ہے۔ خود حکومت کے لیبر فورس سروے کے مطابق اس وقت کُل روزگار کا 75 فیصد تک اس غیر دستاویزی معیشت سے وابستہ ہو چکا ہے جہاں لیبر قوانین کے اطلاق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(197) یہ صورتحال جہاں دیوہیکل پیمانے پر ٹیکس چوری کی غمازی کرتی ہے وہاں اس سے ریاست کی ناکامی اور اس کے خمیر میں موجود وسیع بدعنوانی کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔ مثلاً ایک اندازے کے مطابق 310 ارب روپے کی ٹیکس چوری صرف چائے، تمباکو اور ٹائروں وغیرہ کی غیر قانونی تجارت اور رئیل اسٹیٹ کے شعبے سے وابستہ ہے۔ اسی طرح 53 فیصد ڈیزل، 43 فیصد انجن آئل، 40 فیصد ٹائر، 20 فیصد سگریٹ اور 23 فیصد چائے سمگلنگ کے ذریعے ملک میں درآمد ہوتے ہیں۔ جبکہ متعلقہ ادارے صرف 5 فیصد سمگل شدہ اشیا کو ضبط کرتے ہیں۔ بلکہ حالیہ عرصے میں تو ریاستی اداروں نے اپنے کمیشن اور حصہ داری کے چکر میں بہت سی اشیا کی سمگلنگ کو ایک ادارہ جاتی شکل دے دی ہے۔

(198) صرف دستاویزی معیشت کو مدنظر رکھا جائے تو بھی پاکستان میں ٹیکس وصولی کی شرح جی ڈی پی کا صرف 10 فیصد بنتی ہے جو عالمی معیاروں کے حوالے سے انتہائی کم ہے۔ اس میں سے زیادہ تر بالواسطہ ٹیکس ہوتے ہیں جن کا بوجھ زیادہ تر پہلے سے مفلوک الحال عوام پر پڑتا ہے۔ ایف بی آر کے مطابق کل ٹیکس آمدن کا 60 فیصد بالواسطہ ٹیکسوں سے حاصل ہوتا ہے تاہم کچھ غیر سرکاری اندازے اس سے کہیں زیادہ کے ہیں۔

(199) لیکن اگر غیر دستاویزی معیشت کو شامل کر کے معیشت کے مجموعی حجم کے ساتھ ٹیکس

وصولی کا موازنہ کیا جائے تو یہ شرح 10 فیصد سے بھی بہت زیادہ نیچے گر جائے گی۔ یہ حقیقت معاشی اور انتظامی حوالے سے ایک ناکام ریاست کی غمازی کرتی ہے۔ مثلاً لمز یونیورسٹی کی ایک تحقیق کے مطابق ملک میں ہر 100 روپے کی قابل ٹیکس آمدن میں سے محض 38 روپے کا ٹیکس اکٹھا ہوتا ہے جبکہ باقی رقم بدعنوانی کی نذر ہو جاتی ہے۔

(200) اس غیر دستاویزی معیشت کو 'ڈاکومنٹ' کر کے ٹیکس نیٹ میں لانے کی کوششیں پچھلی حکومتوں میں ناکام ہوئی ہیں۔ کیونکہ سرکاری بدعنوانی کو ایک طرف کر دیں تو بھی اس کے لئے جتنے بڑے پیمانے پر وسائل، مہارتوں اور کاروباری پیٹی بورژوازی پر سختی و جبر کی ضرورت ہے اس کی صلاحیت پھر پاکستانی سرمایہ داری میں نظر نہیں آتی ہے۔ حتیٰ کہ مشرف آمریت بھی یہ کرنے میں ناکام رہی تھی۔

(201) علاوہ ازیں ان میں بہت سی سرگرمیاں اور شعبے ایسے ہیں جن پر ٹیکس لگایا جائے یا ریگولیٹ کیا جائے تو وہ بیٹھ جائیں گے اور سرکاری معیشت کو مزید گہرے بحران میں دھکیل دیں گے۔ الٹا بیشتر صورتوں میں معیشت کو سہارا دینے کے لئے حکومتوں کو اس کالی معیشت کو رعایات دینی پڑتی ہیں کیونکہ دستاویزی میکرو اکانومی کی ترقی اس پر منحصر ہو چکی ہے۔

(202) لیکن یہ غیر دستاویزی معیشت جہاں بڑے پیمانے پر روزگار کا ذریعہ ہے وہاں اس کے انتہائی منفی سماجی مضمرات بھی ہیں۔ ایک طرف تو ان کچی نوکریوں میں استحصال کی شدت دستاویزی معیشت سے کہیں زیادہ ہے جس میں انتہائی کم اجرتیں، کام کے غیر محفوظ حالات اور انتہائی طویل اور کٹھن اوقات کار شامل ہیں جو یہاں کے محنت کش طبقات کی انتہائی مجبوری کی غمازی کرتے ہیں۔ دوسری طرف معیشت کے اس حصے سے جڑی چھوٹے پیمانے کی کاروباری سرگرمیوں نے بالخصوص شہروں میں ایک بے ہنگم معاشرتی ارتقا اور نفسا نفسی کی کیفیت کو جنم دیا ہے جس سے آلودگی، ملاوٹ، ٹریفک جام، ''رش'' اور بھیڑ (Congestion) کے مسائل انتہائی گھمبیر اور اذیت ناک ہو گئے ہیں۔

(203)اسی طرح پیٹی بورژوازی اور بڑے سرمائے سے جڑے کالے دھن کی بات کریں تو اس کی وسیع پیمانے کی مداخلت نے سیاست کو نظریات سے عاری ایک دھونس، دھاندلی اور فراڈ پر مبنی سرگرمی میں تبدیل کر کے لمپن خطوط پر استوار کیا ہے، رئیل اسٹیٹ جیسے طفیلی اور غیر پیداواری شعبوں کو فروغ دیا ہے اور ریاست کو بھی اپنی بدعنوانی کے تقاضوں کے مطابق ڈھالا ہے جس سے ریاستی مشینری بری طرح زنگ آلود ہونے کی طرف گئی ہے۔ نو دولتیوں کی ایک نئی پرت پیدا ہوئی ہے جس کی بیہودہ قسم کی نمود و نمائش، مقابلہ بازی، دو نمبری اور شارٹ کٹ کی سوچ اور رویے عمومی سماجی سوچ کی پراگندگی اور ثقافتی زوال پذیری کا باعث بنے ہیں۔ حتیٰ کہ سماج کی نچلی اور محنت کش پرتوں میں بھی کالی معیشت کا بے لگام پھیلاؤ لمپن رویوں، منشیات اور جرائم کی ترویج کا باعث بنا ہے۔

(204) بحیثیت مجموعی یہ مسلسل پھلتی پھولتی کالی یا غیر دستاویزی معیشت پاکستانی سرمایہ داری کے بیمار اور بحران زدہ ارتقا کی غمازی کرتی ہے جس میں ایک طرف ریاست اپنی رِٹ اور کنٹرول سے محروم ہوتی گئی ہے۔ دوسری طرف قانونی یا جائز طریقوں سے مطلوبہ منافعوں اور روزگار کا حصول محال ہوتا گیا ہے اور دو نمبری اور بدعنوانی ایک سماجی معمول بن کے رہ گئی ہے۔

(205)اسی طرح ملٹری کے کمرشل کاروبار ہیں جو گزشتہ کچھ دہائیوں میں تیزی سے پھیلے ہیں اور ہر قسم کے حکومتی چیک اور ٹیکسیشن سے مستثنیٰ نظر آتے ہیں۔ کئی شعبوں میں یہ انٹر پرائزز ایک اجارہ دارانہ حیثیت اختیار کر چکی ہیں جس میں ظاہر ہے ان کے مالک عسکری اداروں کی سیاسی دھونس اور ریاستی تسلط کا بھی کردار ہے۔ اس سے پھر سول سرمایہ داروں کی منافع خوری بھی متاثر ہوتی ہے۔ ماضی قریب میں نواز شریف کی فوج کے ساتھ چپقلش میں یہ تضاد بھی کارفرما ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ صورتحال ایک بار پھر پاکستانی بورژوازی کی تاریخی ناکامی کی غمازی کرتی ہے جس میں وہ ریاست کو اپنے مکمل کنٹرول میں نہیں لا سکے۔ نتیجتاً عسکری اشرافیہ اپنے اداروں کے ذریعے کمرشل مفادات کی حامل ہو کے منڈی میں ان کی مقابل ہو گئی ہے۔ تاہم ایک بار پھر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ریاست نے حکمران طبقے کی جگہ لے لی ہے۔

(206) ان حالات میں غیر معمولی استثنائی صورتوں کو ایک طرف رکھ کے دیکھیں تو پاکستانی معیشت جہاں ایک اچانک اور فوری انداز میں منہدم ہونے والی نہیں ہے وہاں اس کی بڑے پیمانے پر بحالی اور ترقی کے امکانات بھی مخدوش ہیں۔ لیکن عمومی زوال پذیری کے حالات میں نسبتاً استحکام یا جزوی بحالی کے عرصے بہرحال آسکتے ہیں جن میں میکرو اکنامک اعشاریئے بھی کچھ بہتری کی طرف جائیں۔

(207) بالخصوص ریاستی جبر اور دھونس کے ذریعے کسی حد تک مستحکم سیاسی سیٹ اپ کا قیام (جیسا کہ فی الوقت کوشش جاری ہے) بیرونی و داخلی سرمایہ کاری میں اضافے وغیرہ کے ذریعے کم از کم عارضی طور پر ایسی معاشی صورتوں کو جنم دے سکتا ہے۔ لیکن پاکستانی ریاست اور سیاست جس طرح سے تقسیم، دھڑے بندی اور انتشار کا شکار ہے اس کے پیش نظر حکمران دھڑوں کے ٹکراؤ کی مختلف 'غیر متوقع' صورتوں میں سماجی و سیاسی حالات کے تیزی سے بگڑ جانے کو خارج از امکان قرار نہیں دیا جاسکتا۔ جس سے معاشی بحران مزید بھڑک جائے گا۔

(208) موجودہ معاشی ماڈل کے تحت یہاں بڑے پیمانے کی معاشی گروتھ اسی صورت میں ممکن ہے جب حکومت بالکل ڈھیلی مانیٹری اور فسکل پالیسیاں اپنائے، بڑے پیمانے پر ترقیاتی اخراجات کرے اور درآمدات کو کھلی چھوٹ دے۔ لیکن اس سے پھر خسارے اور قرضے ناگزیر طور پر بڑھیں گے۔ لہٰذا قرضوں کے موجودہ ہجم کیساتھ معاشی و اقتصادی ڈھیل کی پالیسیاں اپنانا انتہائی محال ہو چکا ہے۔

(209) بہرصورت اس معیشت سے ایک جمہوری، ترقی یافتہ اور صحت مند سماج کی تعمیر کی توقع خام خیالی ہی ہے۔ یوں لمبے عرصے میں انفرادی و اجتماعی طور پر مسلسل عدم استحکام، انتشار اور غیر یقینی کی کیفیت ہی اس معاشرے کا معمول رہے گی۔

(210) اسی طرح قومی معیشت کے سوال کو عالمی سرمایہ داری کی اپنی کیفیت سے کاٹ کے ہرگز نہیں دیکھا جاسکتا۔ عالمی سطح پر افراطِ زر میں کمی یا معاشی بوم کے ٹریکل ڈاؤن اثرات

جہاں چھوٹی معیشتوں تک پہنچتے ہیں اور کسی حد تک معاشی پھیلاؤ اور ترقی کا باعث بنتے ہیں وہاں سرمایہ داری کے سامراجی مراکز میں معاشی بحران پاکستان جیسی معیشتوں کی تیز گراوٹ اور سکڑاؤ کا باعث بھی بن سکتا ہے۔ یوں ملکی تناظر کو بین الاقوامی و عالمی تناظر سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

(211) عالمی سطح پر سرمایہ داری کی ایک عمومی زوال پذیری کے تناظر میں دیکھیں تو اور بھی واضح ہو جاتا ہے کہ پاکستان جیسے پسماندہ معاشروں کی جدید خطوط پر استواری کے لئے جس بڑے پیمانے پر صنعتکاری، انفراسٹرکچر کی تعمیر اور صحت و تعلیم میں ریاستی سرمایہ کاری کی ضرورت ہے اس کے لئے مطلوبہ وسائل یہ نظام فراہم کرنے سے یکسر قاصر ہے۔ داخلی طور پر غیر یقینی سیاسی و سماجی صورتحال، معاشی سکڑاؤ، ہنرمند لیبر کے فقدان، توانائی کی بڑھتی قیمتوں جبکہ بین الاقوامی سطح پر عمومی معاشی بحران کے حالات میں یہاں بڑے پیمانے کی بیرونی سرمایہ کاری کے امکانات بھی مخدوش ہو جاتے ہیں۔ انہی عوامل کے تحت گزشتہ مالی سال میں بیرونی سرمایہ کاری بڑھنے کی بجائے 25 فیصد سکڑ گئی ہے۔

(212) اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ یہ معاشرہ انہی حالات میں ہمیشہ قائم رہ سکتا ہے۔ بلکہ ایک مسلسل معاشی و سیاسی انحطاط کی کیفیت میں محنت کش طبقات کی زندگیاں انتہائی اجیرن ہو چکی ہیں اور حالات زندگی مزید تلخ اور تنگ ہی ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ حالات ایک مخصوص نہج پہ پہنچ کے ناگزیر طور پر بڑے سماجی دھماکوں کو جنم دینے کا باعث بن سکتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس بھی معاشی حالات اگر ایک جزوی بحالی، استحکام یا پھیلاؤ کی صورت میں ایک مختلف کیفیت میں داخل ہوتے ہیں تو محنت کش طبقہ اپنے حواس کو کسی حد تک بحال کر کے تاریخ کے میدان عمل میں اترنے کی طرف جا سکتا ہے۔ جہاں اس گلی سڑی سرمایہ دارانہ معیشت کو جڑ سے اکھاڑنا اس کے تاریخی فرائض میں شامل ہوگا۔

*****

(213) اس دستاویز کے پہلے حصے میں ہم نے تاریخی حوالے سے پاکستان میں سلگتے قومی

سوال کا مختصر جائزہ لیا ہے۔لیکن پسماندہ اور تاخیر زدہ ریاستوں میں قومی مسئلے کی نوعیت اور تاریخی وجوہات کے حوالے سے ایک باقاعدہ ضمیمہ آخر میں شامل کیا گیا ہے۔جس میں پھر اس معاملے پر لینن کی پوزیشن کا تفصیلی احاطہ بھی کیا گیا ہے۔لہٰذا فی الوقت ملک میں جاری مختلف قومی تحریکوں کی موجودہ کیفیت تک خود کو محدود رکھیں گے۔

(214) وسائل کی نوآبادیاتی لوٹ مار اور سامراجی نیولبرل معاشی پالیسیوں کے خلاف پاکستانی زیرانتظام جموں کشمیر میں جاری احتجاجی تحریک کے ذریعے ایک بھرپور اور زوردار عوامی ردِعمل سامنے آیا ہے۔قومی جبر اور محرومی کے شکار اس خطے کی گزشتہ 76 سالہ تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ طبقاتی مطالبات نے اپنا اظہار قومی تضادات پر بھی حاوی ہو کے اتنے بڑے پیمانے پہ کیا ہے۔

(215) تین سالوں سے اتار چڑھاؤ کے ساتھ جاری اس تحریک نے بتدریج حکمران اشرافیہ کے نمائندوں سے ایک فاصلہ قائم کیا ہے۔سستی بجلی اور گندم کی فراہمی کے لئے شروع ہونے والی اس تحریک میں وسائل پر اختیار کے مطالبات سمیت دیگر سماجی و معاشی نوعیت کی مانگیں بھی چارٹر آف ڈیمانڈ کا حصہ بنائی گئی ہیں۔یہ پہلی مرتبہ ہو رہا ہے کہ ایک عوامی تحریک نے تمام 10 اضلاع میں اپنے اثرات مرتب کیے اور دسیوں ہزار کی تعداد میں نہ صرف لوگ سڑکوں پر نکلے بلکہ شٹر ڈاؤن اور پہیہ جام ہڑتالیں کی گئیں اور احتجاجی دھرنوں کا سلسلہ درجنوں مقامات پر کئی ماہ تک جاری رکھا گیا۔

(216) برصغیر کے بٹوارے کے وقت یہ خطہ سامراجی منصوبہ سازوں کی سازشوں کی بھینٹ چڑھا اور گزشتہ سات دہائیوں سے اس خطے کے عوام کو مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق اور اختیار نہیں مل سکا۔اس کے برعکس کنٹرول لائن کے دونوں اطراف بننے والی حکومتوں کو بتدریج اختیارات سے محروم کرنے اور نوآبادیاتی جبر اور تسلط کو مضبوط کرنے کے اقدامات کیے جاتے رہے ہیں۔

(217) ایک طرف اس خطے کو سامراجی تنازعے کا شکار کر کے برصغیر کی تقسیم کو مستقل رکھنے کے جواز کے طور پر ایک رستے زخم کی طرح روایتی اور پراکسی جنگوں کے ذریعے کریدا جاتا رہا ہے۔

دوسری جانب وسائل کی لوٹ کے ذریعے یہاں کے لوگوں کی محرومیوں میں اضافہ کیا جاتا رہا۔

(218) اس لوٹ مار اور سامراجی استحصال کا اندازہ یہاں سے لگایا جاسکتا ہے کہ پاکستان کے زیر انتظام کشمیر سے تین ہزار میگاواٹ سے زائد بجلی پیدا ہو رہی ہے، تین ہزار میگاواٹ کے منصوبہ جات زیر تعمیر ہیں اور مجموعی طور پر نو ہزار میگاواٹ سے زائد پن بجلی کے منصوبہ جات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ جبکہ سستی ترین بجلی مہیا کرنے والے اس خطے کے لوگوں کی مجموعی ضرورت 350 سے 400 میگاواٹ ہے۔ تاہم یہ بجلی 40 سے 50 روپے یونٹ تک بشمول ٹیکس شہریوں کو مہیا کی جاتی ہے اور کئی کئی گھنٹے کی لوڈشیڈنگ بھی جاری رہتی ہے۔

(219) فالٹ لائنوں پر ڈیموں کی تعمیر اور اس کے ماحولیاتی مضمرات بھی مقامی آبادی کے لئے باعث تشویش ہیں۔ اس حوالے سے بالخصوص مظفر آباد میں احتجاج جاری رہے ہیں۔

(220) 40 لاکھ نفوس سے زائد آبادی کے اس خطے میں صحت، تعلیم، روزگار اور انفراسٹرکچر کے بنیادی مسائل حل کرنے کی بجائے مقامی حکمران اشرافیہ نوآبادیاتی طفیلیوں کے طور پر وسائل کی سامراجی لوٹ مار سے اپنا حصہ وصول کرنے میں مگن رہی ہے اور ساتھ ہی 'سرکاری تحریک آزادی' کے نام پر عوام کی توجہ ہمیشہ بنیادی مسائل سے ہٹائی گئی ہے۔

(221) سرکاری اور نجی شعبے میں محض تین سے ساڑھے تین لاکھ افراد کے لئے روزگار موجود ہے۔ نجی شعبے میں انتہائی کم اجرتوں پر بری طرح سے محنت کشوں کا استحصال ہو رہا ہے۔ جبکہ نوجوانوں کی بڑی تعداد روزگار کی تلاش میں پاکستان یا بیرون ملک دردبدر کی ٹھوکریں کھانے پہ مجبور ہے۔ جن کے ترسیلات زر سے پھر مقامی حکومت کا نظام بھی چلتا ہے۔ صحت اور تعلیم کے حالات بھی دگرگوں ہیں۔ ان بنیادی سہولیات کے حصول کے لئے بھی مقامی آبادی کو بیشتر صورتوں میں پاکستان کا رخ کرنا پڑتا ہے۔

(222) تاہم حالیہ تحریک ان ساری محرومیوں کو منظر عام پہ لے آئی ہے۔ ان احتجاجوں میں ہزاروں خواتین کی ہراول شمولیت نے بھی ایک نئی تاریخ رقم کرتے ہوئے حکمران طبقات کی

مسلط کردہ پسماندہ اقدار پر کاری ضرب لگائی ہے۔اسی طرح ایک منظم مہم کے تحت 75 سے 80 فیصد تک بجلی بلوں کا بائیکاٹ کیا گیا ہے۔ جو اس نظام حکومت کے خلاف ایک طرح کا عوامی ریفرنڈم ہے۔

(223) اشترا کی تحریکوں سے پھر ایک یکجہتی پر مبنی نئی ثقافت جنم لیتی ہے۔سماج پر چھائی حکمران طبقے کی نفسیات اور ثقافت کے غلاف کو پھاڑ کر حقیقی اور بے لوث انسانی رشتے اور تعلقات سامنے آتے ہیں۔ باہمی تعاون اور یکجہتی کی نئی مثالیں قائم ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔سماج خود رو انداز میں منظم ہونا شروع ہو جاتا ہے۔عام لوگ جب اجتماعی طور پر جبر سہنے سے انکار کرتے ہیں تو معاشرہ یکسر تبدیل ہو جاتا ہے۔ بظاہر دھوکہ دہی، لالچ، حسد، بغض اور دوسرے کو فتح کر دینے والی نفسیات، جسے انسانی فطرت قرار دیا جاتا ہے، مکمل طور پر تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہ سب کچھ اس تحریک کے دوران نظر آیا ہے۔ جہاں پسماندہ ترین دیہاتوں میں لوگ خود رو طریقے سے منظم ہوئے ہیں اور عوامی کمیٹیاں تشکیل پائی ہیں۔

(224) اس تحریک نے پاکستان کے مختلف شہروں میں بھی اپنے اثرات مرتب کیے ہیں۔ جہاں مہنگی بجلی کے خلاف احتجاجی مظاہروں اور عوامی ایکشن کمیٹیاں بنانے کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ تاہم یہ سلسلہ زیادہ آگے نہیں بڑھ سکا۔لیکن آنے والے دنوں میں دوبارہ بھی شروع ہو سکتا ہے۔

(225) ریاست نے اپنے ایجنٹوں کی مداخلت اور جبر سمیت تحریک کو کچلنے یا زائل کرنے کے کئی ہتھکنڈے استعمال کیے ہیں۔جن میں مقدمے، گرفتاریاں اور دھرنوں پر کریک ڈاؤن بھی شامل ہے۔لیکن اس دوران خود ریاستی مشینری میں ایک تذبذب اور ہچکچاہٹ بھی دیکھنے میں آئی ہے۔علاوہ ازیں عوام کی بھرپور طاقت اور یکجہتی کے سامنے یہ سارے حربے ناکام و نامراد ہی ثابت ہوئے ہیں۔

(226) لیکن اپنی تمام تر وسعت اور جرات کے باوجود پاکستانی زیر انتظام کشمیر جیسے خطوں کی جغرافیائی محدودیت اور نسبتاً کم آبادی جیسی وجوہات کی بنا پہ ایسی تحریکوں کا تناظر پھر کئی حوالوں

سے دوسرے خطوں میں سیاست اور طبقاتی جدوجہد کی صورتحال پہ منحصر ہو جاتا ہے۔ علیحدگی اور تنہائی کی کیفیت میں ظاہر ہے وہ ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی ہیں۔

(227) انقلابی قوتوں نے اپنی محدود مقدار یا طاقت کے باوجود تحریک پر واضح نقوش چھوڑے ہیں۔ تحریک کی اس کیفیت اور مرحلے پر شاید اتنا ہی ممکن تھا۔ تنگ نظر قوم پرست رجحانات اور تاجر یونینوں کی مرکزی ایکشن کمیٹی میں اکثریتی موجودگی کے باعث مذاکرات کا عمل بھی ایک غیر سنجیدگی کا شکار رہا۔ یہی وجہ ہے کہ تحریک کی شدت کے شایان شان مطالبات کی منظوری ممکن نہیں ہو پائی۔

(228) ایسے میں وقتی طور پر تحریک ایک جمود یا سرد مہری کا شکار ضرور ہو گئی ہے لیکن اس سے محنت کشوں، طلبہ اور خواتین نے بیش قیمت اسباق اور تجربات حاصل کیے ہیں۔ علاوہ ازیں اس عمل نے جن سوالات کو جنم دیا اور جن ایشوز کو ابھارا ہے وہ سماجی شعور میں مسلسل سلگتے رہیں گے اور ناگزیر طور پر دوبارہ اپنا اظہار کریں گے۔ مستقبل کے ان واقعات کے لئے انقلابیوں کو نہ صرف کشمیر بلکہ پورے خطے میں خود کو واضح اور بے لاگ نظریاتی خطوط پر جرات کے ساتھ سیاسی و تنظیمی طور پر تیار کرنے کی ضرورت ہے۔

(229) جموں کشمیر تنازعہ سے منسلک پاکستان کے زیر انتظام خطہ گلگت بلتستان میں بھی نوآبادیاتی جبر اور سامراجی لوٹ مار کے خلاف جدوجہد ایک نئے مرحلے میں داخل ہو رہی ہے۔ دشوار گزار پہاڑی سلسلوں پر مشتمل یہ خطہ جہاں بلند و بالا برفانی چوٹیوں کی سیاحت کے حوالے سے شہرت رکھتا ہے وہیں معدنی ذخائر کی دولت سے مالا مال یہاں کے باسی گزشتہ سات دہائیوں سے انتہائی کسمپرسی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ چین اور پاکستان کے درمیان زمینی راستے کا ذریعہ ہونا اس خطے کی تذویراتی اہمیت کا باعث بھی ہے۔

(230) ایف سی آر جیسے کالے قوانین کے نفاذ کے خلاف جدوجہد کی ایک طویل تاریخ کے باوجود آج بھی اس خطے کے لوگ حقیقی سیاسی نمائندگی سے محروم ہیں۔ فیصلوں اور اختیارات کا

منبع اسلام آباد ہی ہے۔ وسائل سے مالا مال ہونے کے باوجود تعلیم، صحت، روزگار اور انفراسٹرکچر کی سہولیات ناپید ہیں۔ فی کس آمدن سے شرح خواندگی تک انسانی ترقی کے تمام اشاریوں میں اس خطے کی درجہ بندی سب سے نیچے ہے۔

(231) تاہم آئینی، سیاسی اور معاشی حقوق کی بازیابی کے لئے یہاں کے لوگوں نے طویل جدوجہد کی ہے۔ لیکن شدید ترین سرد موسم میں کئی کئی روز کے احتجاجی دھرنے ہوں یا اسلام آباد کی جانب لانگ مارچ ہوں۔ ہر بار ان سے دھوکہ کیا گیا اور حقوق دینے کے نام پر پے در پے اسلام آباد سے جاری کیے جانے والے حکم ناموں کے ذریعے اختیارات کو مزید چھینا ہی گیا ہے۔

(232) اب ایک بار پھر گلگت بلتستان میں گندم کی قیمتوں میں اضافے کے خلاف منجمد کر دینے والی سردی میں احتجاجی دھرنوں کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔ عوامی ایکشن کمیٹیوں کے بینر تلے یہ جدوجہد مختلف وقفوں کے بعد سر اٹھاتی رہی ہے۔ دیہاتیوں کے زیر استعمال زمینوں کو حکومتی تحویل میں لینے اور سرمایہ کاروں کے حوالے کرنے اور معدنی ذخائر کے استحصال کے لئے پہاڑوں کو لیز پر دینے کے سلسلوں کے خلاف بھی متعدد احتجاجی تحریکیں گزشتہ سالوں میں نظر آئی ہیں۔

(233) ان احتجاجی اور مزاحمتی تحریکوں کا زور توڑنے اور انہیں پورے گلگت بلتستان میں پھیلنے سے روکنے کے لئے فرقہ وارانہ فسادات اور دہشت گردی کے واقعات کا استعمال بھی کیا گیا ہے۔ تاہم یہ حربے اب گلگت بلتستان کے شہریوں کو منقسم کرنے کے لئے زیادہ کارگر ثابت نہیں ہو رہے ہیں۔

(234) تحریک کا مرکز سکردو ہی ہے۔ لیکن یہ وہاں سے ہنزہ اور استور تک پھیلتی جا رہی ہے۔ ہزاروں افراد احتجاجی ریلیوں اور دھرنوں میں شریک ہو رہے ہیں۔ چارٹر آف ڈیمانڈ میں گندم کی قیمت 22 روپے فی کلو اور فی کس 9 کلو گندم فراہم کرنے، گلگت بلتستان فنانس ایکٹ کو کالعدم قرار دینے، تمام ٹیکسوں کے خاتمے، بجلی کی فراہمی میں اضافے، وفاق کے ساتھ این ایف سی طرز کے معاہدے، تمام غیر آباد اور بنجر زمینوں کو عوامی ملکیت تسلیم کرنے، گلگت بلتستان آئین ساز اسمبلی کے قیام، دیامر بھاشا ڈیم میں 80 فیصد رائلٹی دینے، غیر مقامی افراد کو جاری مائننگ لیز

کی منسوخی اور مقامی افراد کو لیز دینے، ہوٹلوں اور ٹرانسپورٹ کو انڈسٹری کا درجہ دینے، میڈیکل اور انجینئرنگ کالجوں اور خواتین کے لئے الگ یونیورسٹی کے قیام اور آئین ساز اسمبلی کی تشکیل تک گندم، مٹی کے تیل، خوردنی تیل، ہوائی سفر اور دیگر ضروریات زندگی پر سبسڈی کی ادائیگی جیسے مطالبات شامل کیے گئے ہیں۔

(235) جواب میں ریاست کی جانب سے انسداد دہشت گردی کے قوانین بالخصوص شیڈول فور کا بے دریغ استعمال کیا جا رہا ہے۔ متعدد سیاسی اور سماجی رہنماؤں کو شیڈول فور میں شامل کر کے ان کی نقل و حرکت کو محدود کیا جا رہا ہے۔ تاہم مزاحمت رکنے کی بجائے بڑھتی ہی جا رہی ہے۔

(236) ابھی تک یہ جدوجہد عوامی ایکشن کمیٹیوں کے ذریعے منظم ہو رہی ہے۔ ان کمیٹیوں میں سیاسی و سماجی کارکنان اور مذہبی عناصر بھی موجود ہیں۔ قوم پرست اور ترقی پسند رجحانات بھی ہیں۔ لیکن ان کی تعداد کم ہے۔ مروجہ سیاسی نظام اور جماعتوں پر تو عدم اعتماد کا اظہار کیا جا رہا ہے لیکن متبادل قیادتیں بھی نظری اور فکری کمزوریوں کی وجہ سے ایک واضح انقلابی پروگرام تشکیل دینے سے قاصر رہی ہیں۔

(237) اس خطے کی تمام تر سیاست کو پاکستان کا صوبہ بنانے یا نہ بنانے جیسے نان ایشوز کے گرد محدود کر دیا جاتا ہے۔ ایک لمبے عرصے کی طویل اور صبر آزما جدوجہد کے باوجود نتائج نہ ملنے کی وجہ سے نوجوان کسی انقلابی متبادل کی ضرورت ضرور محسوس کر رہے ہیں۔ جو ایک انقلابی مارکسی اور سوشلسٹ پروگرام کی صورت میں ہی فراہم ہو سکتا ہے۔ اس فقدان یا خلا کو پر کرنے کے لئے بالخصوص ہمسایہ خطوں کے انقلابیوں کو اپنا بھرپور کردار ادا کرنا ہوگا۔

(238) بلوچستان میں قومی آزادی کی جدوجہد کا آغاز 1948ء سے ہی ہو گیا تھا۔ لیکن اتنی طویل جدوجہد کے باوجود نہ تو بلوچ آزادی حاصل کر سکے، نہ ہی پاکستانی ریاست اس سرکشی کو یکسر دبا دینے میں کامیاب ہو سکی۔ ایسے میں بلوچ یکجہتی کونسل کے حالیہ مارچ اور اسلام آباد میں دھرنے نے ایک بار پھر بلوچستان میں جاری شدید ریاستی جبر اور محرومی کی کیفیات کو عیاں کیا ہے۔

لیکن ان کے مقابلے میں ریاستی ایجنٹوں کا جو کیمپ لگوایا گیا ہے اس سے قومی تحریکوں میں موجود طبقاتی تقسیم بھی بالکل واضح ہوگئی ہے۔ان دو دھرنوں کے کیمپ بنیادی طور پر ایک قوم میں موجود دو طبقاتی کیمپوں کی غمازی کرتے ہیں۔

(239) ان آوازوں کے پہاڑوں اور پسماندہ شہر دیہاتوں سے نکل کے اسلام آباد پہنچ جانے سے ریاست شدید پریشانی اور بوکھلاہٹ میں مبتلا ہے۔پیپلز پارٹی میں جس طرح 'باپ' پارٹی اور ریاستی پشت پناہی میں سرگرم وحشی مسلح جتھوں کے لوگ شامل کروائے گئے ہیں اس کے پیچھے آنے والے دنوں میں بلوچستان کا صوبائی اقتدار پیپلز پارٹی کے حوالے کر کے جبر و بربریت شدید کرنے کی پالیسی کارفرما ہوسکتی ہے۔

(240) بلوچ قوم پرستی کے کچھ رجحانات پارلیمانی سیاست کے ذریعے حقوق کی جدوجہد پر یقین رکھتے ہیں۔لیکن ان میں سے بیشتر قیادتیں ریاست سے مصالحت اور مفاہمت کے عمل میں کاسہ لیسی کی حد تک پہنچ چکی ہیں۔ان میں نواز شریف کے 'ترقی پسند' اتحادی بھی شامل ہیں۔

(241) دوسری طرف مسلح جدوجہد کرنے والے گروہوں میں دوسری سامراجی طاقتوں کی مدد سے آزادی حاصل کرنے کی سوچ حاوی نظر آتی ہے۔نتیجتاً اس سارے عمل میں امریکہ، چین، ایران اور ہندوستان جیسی قوتوں کی مداخلت نے کئی پیچیدگیوں کو جنم دیا ہے۔

(242) 1970ء اور 80ء کی دہائیوں تک بلوچستان کی قومی تحریک میں انقلابی نظریات اور ترقی پسندانہ رجحانات کی گہری چھاپ موجود تھی۔جس کے تحت سوشلسٹ انقلاب کو قومی نجات کا ذریعہ قرار دیا جاتا تھا۔یا کم از کم قومی آزادی کی جدوجہد کو سوشلسٹ پروگرام سے جوڑا ضرور جاتا تھا۔لیکن سوویت یونین کے انہدام اور ملکی و عالمی سطح پر مزدور تحریک کے بحران نے یہاں بھی قومی قیادتوں میں موقع پرستی اور نظریاتی زوال پذیری کے رجحانات کو جنم دیا ہے۔

(243) لیکن گزشتہ عرصے میں بلوچ نوجوانوں کی ہراول پرتیں ایک بار پھر مارکسزم اور سوشلزم کے نظریات کی طرف مائل ہوئی ہیں جس کا واضح اظہار نہ صرف بی ایس او کے مختلف

دھڑوں بلکہ کسی حد قوم پرست جماعتوں کے سنجیدہ کارکنان میں بھی ہوتا ہے۔اسی طرح انفرادی دہشت گردی اور مسلح جدوجہد کی طریقوں کی محدودیت بھی بہت سے نوجوانوں پر واضح ہوئی ہے۔ اس کے نتیجے میں ایک نئے سیاسی عمل نے جنم لیا ہے جس کا اظہار طبقاتی مطالبات کی حامل طلبہ تحریکوں کے ابھار سے بھی ہوتا ہے۔گوادر کی تحریک بھی اس حوالے سے اہم پیش رفت ہے۔بلوچ یکجہتی کونسل کا مارچ اور دھرنا بھی اس نئے سیاسی تحرک کا ہی حصہ ہے۔ان احتجاجوں یا تحریکوں نے دوسری قوموں کے محنت کشوں اور نوجوانوں سے جڑت اور یکجہتی کی راہیں بھی ہموار کی ہیں۔

(244) بلوچ نوجوانوں کی طرح بلوچستان میں آباد پشتون، ہزارہ اور دوسری قوموں کی نئی نسل میں بھی انقلابی نظریات کی ایک پیاس موجود ہے۔جس کا اظہار سیاسی بحثوں کے اعلیٰ معیار کے ساتھ ساتھ ترقی پسند لٹریچر کی بے پناہ طلب کی صورت میں بھی ہوتا ہے۔

(245) بلوچستان کے پختونوں میں بھی ایک احساس محرومی موجود ہے جس کے نتیجے میں یہاں ایک علاقائی یا مقامی نوعیت کی پختون قوم پرستی استوار ہوئی ہے۔لیکن بالعموم اس خطے میں آباد مختلف قوموں کے لوگ خاصی ہم آہنگی سے اکٹھے زندگی گزارتے چلے آرہے ہیں۔

(246) لیکن دنیا کے بیشتر پسماندہ خطوں کی طرح بلوچستان کے عوام کے لئے بھی ان کے بے شمار معدنی وسائل اور وسیع وعریض ساحلوں کو اس نظام نے ایک عذاب بنا دیا ہے۔اس سامراجی کھیل نے یہاں پر کسی جنگوں کو بھی جنم دیا ہے اور بنیاد پرست قوتوں کو بھی ابھارا ہے۔ان حالات میں سامراج سے آزادی اور قومی نجات کا حصول آخر کار اس پورے خطے میں سرمایہ داری کے خاتمے سے جڑ گیا ہے۔

(247) پختونخواہ کے بیشتر علاقوں کو ثور انقلاب کے خلاف ڈالر جہاد کے لانچنگ پیڈز کے طور پر استعمال کیا گیا جس سے یہاں مسلسل عدم استحکام اور دہشت گردی کا وہ سلسلہ شروع ہوا جو آج تک جاری ہے۔اس سامراجی پراجیکٹ سے جڑے وسیع وعریض کالے دھن کی سرایت نے یہاں قبائلی پسماندگی کیساتھ مل کے ایسی زہریلی شکل اختیار کر لی کہ ثقافت اور معاشرت کو مسخ

کر کے رکھ دیا۔

(248) پھر انہی جہادی گروہوں میں سے بے قابو ہو جانے والوں کے خلاف پے در پے فوجی آپریشنوں کا سلسلہ شروع کیا گیا جس نے عام لوگوں کی بربادیوں اور تباہ کاریوں کو نئی نہج پہ پہنچا دیا۔ انہی بربادیوں اور خونریزیوں سے پھر پی ٹی ایم کی بغاوت نے جنم لیا اور روایتی یا مروجہ قوم پرست قیادتوں کے سیاسی دیوالیہ پن، موقع پرستی، بدعنوانی اور مترو کیت کو بے نقاب کر کے رکھ دیا۔ ان حالات میں ان روایتی قیادتوں سے بیزار نوجوانوں کی بڑی تعداد نے پی ٹی ایم میں متحرک شمولیت اختیار کی ہے۔

(249) لیکن اپنے انتہائی معقول مطالبات اور ریاستی جبر کے سامنے تمام تر جرات اور بہادری کے باوجود یہ تحریک زیادہ تر قوم پرستی کے خول میں ہی محدود رہی ہے۔ جس میں ظاہر ہے ملک کی عمومی معروضی صورتحال کا بھی کردار ہے۔ لیکن پی ٹی ایم کی قیادت کا کم از کم ایک حاوی حصہ شروع دن سے شدید ابہام کا شکار رہا جس میں کبھی اس تحریک کو غیر سیاسی قرار دیا جاتا رہا اور کبھی پارلیمانی اور انتخابی سیاست کو یکسر رد کیا گیا۔ اسی طرح تحریک کے لائحہ عمل کی تشکیل بھی مسلسل تذبذب کا شکار رہی۔

(250) قیادت میں نظریاتی و سیاسی یکسوئی کے فقدان نے پھر تحریک کی مختلف دھڑوں میں تقسیم کو بھی جنم دیا۔ جس میں ایک حصہ مشکوک سیاسی پس منظر کے حامل لوگوں کے اثر و رسوخ میں آ کے ایک لبرل جمہوری نوعیت کی پارٹی کا اعلان کر کے الگ ہو گیا۔ جسے ایک آدھ سیٹ سے ہٹ کر کوئی بڑی مقبولیت ملنے کے امکانات مخدوش ہی ہیں۔ ایک حصے نے تحریک کے اندر رہتے ہوئے ہی پارلیمانی سیاست کا راستہ اپنایا۔ جو ایک نسبتاً معقول حکمت عملی تھی۔ جبکہ مرکزی یا کلیدی قیادت ابھی بھی ''غیر سیاسی'' نوعیت کے ابہاموں کا شکار نظر آتی ہے۔

(251) کٹھن معروضی حالات میں تحریک کو ایک لمبے عرصے تک چلانے کے لائحہ عمل کے فقدان، داخلی تقسیم اور طبقاتی مسائل کو پروگرام و مطالبات کا حصہ بنانے میں ہچکچاہٹ جیسے عوامل

نے پی ٹی ایم کی مزاحمتی صلاحیت کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ کیونکہ محض جذباتی نعرے بازی اور وقتی جوش وخروش کی بنیاد پر تحریکوں کے مومنٹم کو مستقل برقرار نہیں رکھا جا سکتا۔

(252) اس عرصے میں ریاست کو بھی سنبھلنے کا موقع ملا ہے جس میں انہوں نے اس تحریک سے نمٹنے کی پالیسی کو خاصی ٹھوس شکل دی ہے۔ لیکن کئی جگہوں پر ریاست کو پسپائی بھی اختیار کرنی پڑی ہے۔ مثلاً سوات میں بنیاد پرست گروہوں کو دوبارہ مسلط کرنے کا سلسلہ انہیں روکنا پڑا ہے جس میں پی ٹی ایم کی ہی ایک شاخ یا آف شوٹ کی ایجی ٹیشن کا کلیدی کردار تھا۔ اسی طرح ناکوں اور چیک پوسٹوں کی سختی میں بھی کچھ کمی لائی گئی ہے۔ جو جزوی یا وقتی ہی سہی لیکن تحریک کی حاصلات ضرور ہیں۔

(253) اس کا یہ مطلب نہیں کی یہ تحریک بالکل ختم یا زائل ہوگئی ہے لیکن اس کا ابتدائی زور کافی حد تک ٹوٹنے کی طرف گیا ہے۔ جس کے نتیجے میں قیادت کے کچھ حصوں کی جانب سے پھر مہم جوئی پر مبنی نعروں اور مطالبات نے شدت اختیار کی ہے۔ جو کوئی زیادہ مناسب لائحہ عمل نہیں ہے۔ یہ سارا عمل انتہائی ریڈیکل، دیانتدارانہ اور کسی حد تک ترقی پسندانہ شکل میں بھی قوم پرستی کی محدودیت اور قومی حقوق کی جدوجہد کے دھاروں کو طبقاتی جدوجہد کے سمندر میں شامل کرنے کی ناگزیریت کو واضح کرتا ہے۔

(254) پشتون قوم پرست قیادتوں میں بھی امریکی سامراج سے متعلق خوش فہمیوں کا رجحان پایا جاتا ہے۔ ان میں سابقہ سٹالنسٹوں کی بھی شمولیت ہے جو اب جمہوریت اور انسانی حقوق کے لبادے میں قومی تحریک کو سرمایہ دارانہ لبرلزم اور سامراج کے تسلط میں لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اگر غور کریں تو اے این پی جیسے رجحانات بڑی حد تک گل سڑ کے ریاستی سپورٹ اور اجازت کے محتاج ہو چکے ہیں۔ ان حالات میں پی ٹی ایم نے اپنی تمام تر کمزوریوں اور محدودیت کے باوجود پشتون معاشرے میں سلگتی ان محرومیوں، مسائل اور تضادات کو آشکار کیا ہے جو ایک انقلابی حل اور لائحہ عمل کے متلاشی ہیں۔

(255) سرائیکی خطے میں محرومی اور بدحالی کی ایک داستان نظر آتی ہے۔ جس کی وجہ سے

یہاں 'تخت لاہور' کے قیدی ہونے کا حاوی احساس یا تاثر موجود ہے۔

(256) ہر قومیت کی طرح یہاں کے حکمران بھی انتہائی گماشتہ، بدکردار اور رجعتی ہیں۔ نسل در نسل اس خطے کے دہقانوں، مزارعوں اور مزدوروں کا خون چوسنے والی ان معزز اور مقدس شخصیات کو انگریز سامراجیوں کی خدمت گزاری اور وفاداری کے صلے میں جاگیریں عطا ہوئی تھیں۔ ان کی اولادیں اب سرمایہ دارانہ جبر و استحصال کے نئے طریقوں سے دولت اور طاقت مجتمع کرنے میں سرگرم ہیں۔ لیکن ان کا کردار یہی رہا ہے یہ اپنے لوگوں کی محرومیوں کا سودا کرتے ہوئے اقتدار میں حصہ داری کے ذریعے اپنی مراعات اور دولت میں اضافہ کرتے ہیں۔

(257) لیکن سرائیکی خطے کے عوام میں ان سرداروں، جاگیرداروں اور پیروں وغیرہ کے خلاف شدید نفرت بھی پائی جاتی ہے۔ جس کا اظہار اس خطے کی شاعری میں بھی ہوتا ہے۔ اس حوالے سے یہاں ترقی پسندانہ ادب کی تخلیق اور عوامی مشاعروں کے انعقاد کی بڑی مثبت روایت پائی جاتی ہے۔ ان محفلوں میں پھر سماجی مسائل اور طبقاتی تضادات بھی اجاگر ہوتے ہیں۔

(258) بنیاد پرست عناصر کی طرف سے اس خطے کی وسیع بیروزگاری اور پسماندگی کا فائدہ اٹھانے کی بھرپور کوششیں کی گئی ہیں۔ جن میں مدارس بھی قائم کیے گئے اور جہادی گروہوں کے لئے ریکروٹمنٹ کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا۔ بہت سے نوجوان کالے دھن اور دہشت کی اس آگ کا ایندھن بھی بنے ہیں۔ لیکن یہاں کے عوام نے ایسے رجحانات کو زیادہ تر مسترد ہی کیا ہے۔ کیونکہ تاریخی طور پر اس خطے کی سماجی اقدار اور رویے بڑی حد تک سیکولر رہے ہیں۔

(259) وسیب میں تعلیم اور روزگار کے مواقعوں کی شدید قلت کی وجہ سے یہاں سے نوجوانوں کی بڑی تعداد پھر وسطی اور شمالی پنجاب کا رخ کرتی ہے۔ اسی طرح کراچی کی طرف بھی ہجرت کا بڑا سلسلہ جاری ہے۔ یہ نوجوان طلبہ یا مزدور جب نسبتاً ترقی یافتہ شہروں اور صنعتی مراکز میں زندگی گزارتے ہیں تو ان کے شعور میں گہری تبدیلیاں جنم لیتی ہیں اور وہ طبقاتی جبر و استحصال کی جدید شکلوں اور عہد حاضر کے تقاضوں کو زیادہ گہرائی میں سمجھنے اور پرکھنے کے قابل ہوتے ہیں۔

اس عمل کا اظہار حالیہ سالوں میں سرائیکی خطے میں نئی یونیورسٹیوں کے قیام اور تعلیمی سہولیات کی بہتری کے مطالبات سے بھی ہوتا ہے۔

(260) سرائیکی قوم پرست حلقوں کی طرف سے الگ صوبے کا مطالبہ بھی کیا جاتا رہا ہے۔لیکن یہ وسائل کی منصفانہ تقسیم اور پسماندگی ومحرومی کے ازالے کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔ کیونکہ بدحالی اور خساروں سے دوچار معیشت میں نئے انتظامی ڈھانچے بھی وسائل کی قلت کا شکار اور مفلوج ہی رہتے ہیں۔ایسے میں تخت لاہور پہ سرائیکی وزیراعلیٰ بھی بٹھا دیا جائے تو سرائیکی خطے کے محکوموں کی زندگیوں میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں آسکتی۔ان ذلتوں اور محرومیوں سے نجات نئے صوبے نہیں بلکہ نئے نظام کی متقاضی ہے۔

(261) سندھ میں بھی ریاستی جبر کی شدت کا اظہار جبری گمشدگیوں اور جعلی پولیس مقابلوں کے واقعات کی شکل میں ہوتا ہے۔جبکہ یہ سارا خونی کھیل پیپلز پارٹی کی حکومت میں جاری وساری ہے۔

(262) دوسرے صوبوں میں اپنی حمایت اور ووٹ بینک بڑی حد تک کھونے کے بعد پیپلز پارٹی نے سندھ کارڈ کا استعمال بڑھا دیا ہے۔اس حوالے سے سندھ میں ترقیاتی کاموں کا بھی گزشتہ کچھ سالوں سے بہت چرچا کیا جارہا ہے۔جن میں کچھ سڑکیں، ہسپتال اور اربن ٹرانسپورٹ کے کچھ منصوبے وغیرہ شامل ہیں۔لیکن اگر سندھ میں پسماندگی، غربت اور بدحالی کی انتہاؤں پہ غور کریں تو ان منصوبوں کی فروعی یا نمائشی حیثیت فوراً واضح ہوجاتی ہے اور ان کی آڑ میں تجوریاں بھرتے چلے جانے کی وسیع واردات بھی بے نقاب ہوجاتی ہے۔

(263) اس معاشرے کو نسل در نسل لوٹ کے سماجی دولت کا مٹھی بھر حصہ یہ حکمران واپس عوام پہ خرچ کردیتے ہیں تو انقلابیوں کا کام اس فریب کی وکالت اور دلالی کرنا نہیں بلکہ اسے بے نقاب کرنا ہوتا ہے۔اپنی گرتی ہوئی ساکھ اور سیاسی حمایت بچانے کے لئے انہیں کچھ لوگوں کو مفت علاج دینا پڑ رہا ہے تو یہ کوئی احسان نہیں کررہے۔دوسری طرف اسی سندھ کی یہ حالت ہے کہ 80

فیصد آبادی کو پینے کا صاف پانی میسر نہیں ہے۔ جتنے لوگوں کا ان سرکاری ہسپتالوں میں علاج ہوتا ہے اس سے کئی گنا زیادہ مریض یہ گندا پانی ہر روز پیدا کرتا ہے۔

(264) ان کے سندھ کارڈ کو بھی زیادہ مقبولیت پیٹی بورژوازی میں ہی ملتی ہے۔ جبکہ وسیع تر عوام اس کھلواڑ سے لاتعلق اور بیزار ہی نظر آتے ہیں۔

(265) سندھ میں پیپلز پارٹی کی حکومتوں کے قیام میں بھی عوامی حمایت سے زیادہ کردار ریاستی پشت پناہی اور دھونس اور دھاندلی کی سیاست کا ہی ہوتا ہے۔ کیونکہ مسلسل صوبائی اقتدار میں رہنے کے نتیجے میں پیپلز پارٹی، سندھی اشرافیہ کے ایک بڑے حصے اور ریاستی مشینری کے مالی و سیاسی مفادات کے ملاپ سے ایک طرح کا 'سٹیٹس کو' تشکیل پایا ہے۔ جو پھر ان کے اگلے اقتداروں کی بنیادیں فراہم کرتا ہے۔

(266) لیکن پھر ان کے مقابلے میں جو گرینڈ ڈیموکریٹک الائنس جیسی قوتیں ابھاری جاتی ہے وہ بھی اس قدر رجعتی اور عوام دشمن ہیں کہ پیپلز پارٹی کا متبادل نہیں بن سکتیں۔ اسی طرح سندھی قوم پرست رجحانات ہیں جو لسانی تعصب اور تنگ نظری میں بعض اوقات فسطائیت کی حد تک چلے جاتے ہیں اور شہری سندھ میں مقیم دوسری قوموں کے محنت کشوں کے خلاف نفرت اور حقارت کو ہوا دیتے ہیں۔ عوام کے مسائل کے حل کا کوئی ٹھوس پروگرام اور لائحہ عمل ان کے پاس نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی حمایت ہمیشہ محدود ہی رہی ہے۔

(267) ان حالات میں سرمایہ داری کی حدود میں قومی مسئلے کا حل تلاش کرنا ایک فریب اور حماقت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس نظام کے اندر نہ محکوم خطوں میں کوئی ہموار، دوررس اور دیرپا ترقی اور خوشحالی آسکتی ہے۔ نہ قومی بنیادوں پر علیحدگی' آزادی کی ضمانت بن سکتی ہے۔ ان تاخیر زدہ معاشروں کے دوسرے بنیادی مسائل کی طرح قومی سوال کے حل کا فریضہ بھی سوشلسٹ انقلاب کو ہی ادا کرنا پڑے گا۔

*****

(268) کسی بھی سماجی نظام کی زوال پذیری کا مجتمع شدہ اظہار اس کی ثقافتی گراوٹ میں ہوتا ہے۔ ثقافت صرف موسیقی، لباس یا طرز تعمیر تک ہی محدود نہیں ہوتی بلکہ لوگوں کے رویوں، رشتوں، میل جول اور اٹھنے بیٹھنے کے انداز، اخلاقیات، سوچ اور نفسیات، شاعری اور ادب سمیت سماجی زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کرتی ہے۔ لیکن اس کا سرچشمہ آخری تجزیئے میں پھر پیداواری عمل یا معیشت ہوتی ہے۔ جس کا بحران نہ صرف سیاست بلکہ ثقافت کا بھی بحران بن جاتا ہے۔

(269) اپنے تمام تر جبر و استحصال اور ہر شعبے پر حکمران طبقے کی اجارہ داری کے باوجود ایک طبقاتی نظام بھی جب سماجی دولت اور معیارِ زندگی میں اضافہ کر رہا ہوتا ہے اور عام لوگوں کی زندگیوں کو کسی قدر سہولت، آسودگی، استحکام اور فرصت دینے کے قابل ہوتا ہے تو ثقافت کو جلا ملتی ہے (اگرچہ مادی ترقی کی اعلیٰ سطحوں پر بیگانگی بھی نئی شکلوں میں اپنا اظہار کرتی ہے)۔ لیکن اسی نظام کی متروکیت کے عہد میں معیشت جب غربت کا شکار ہو جائے تو ثقافت بھی مفلسی سے دوچار ہو جاتی ہے۔ مہنگائی اور بیروزگاری کے نہ ختم ہونے والے عذاب انفرادی بقا کی جدوجہد کو تیز کر دیتے ہیں جس سے مستقبل کے حوالے سے غیر یقینی کی کیفیت، سماجی انتشار، نفسانفسی اور مطلب پرستی معمول بن جاتے ہیں۔ لوگوں کے رویے تلخ اور ترش ہو جاتے ہیں، پیری فقیری کو فروغ حاصل ہوتا ہے، نفسانفسی بڑھ جاتی ہے، زندگیاں غیر محفوظ ہو جاتی ہیں، رشتے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے لگتے ہیں اور منافقت ہر تعلق واسطے میں اپنا زہر گھولنے لگتی ہے۔ موسیقی، شاعری اور سینما وغیرہ کا معیار گر جاتا ہے۔

(270) ایسے حالات اگر محنت کش طبقے کے بڑے تحرک سے عاری ہوں تو عام لوگوں میں ایک بیگانگی، یاس، ناامیدی اور بے بسی کی نفسیات کو حاوی کر دیتے ہیں۔ زندگی کی تنگی مسلسل بڑھتی جائے اور مستقبل میں کسی بہتری کی امید جب دم توڑ جائے تو تلخ ماضی بھی بہتر معلوم ہونے لگتا ہے جس میں لوگ نہ صرف انفرادی بلکہ اجتماعی طور پر بھی پناہ تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یا پھر موت کے بعد کی زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش کرنے لگتے ہیں۔ یہی وہ عمل ہوتا ہے جس کے تحت

ایسے وقتوں میں مذہبیت اور قدامت پرستی کے رجحانات مختلف شکلوں میں عود کر آتے ہیں۔

(271) جب ہم کہتے ہیں کہ انسان قدامت پسند واقع ہوا ہے تو اس کا ایک مطلب یہ ہوتا ہے کہ غیر انقلابی ادوار میں انسانوں کی اکثریت مروجہ نظام کے اندر رہتے ہوئے ہی اپنے مسائل کو حل کرنے کی کوششوں میں مصروف رہتی ہے۔ لیکن جب بحران بڑھتا جا رہا ہو اور انقلابی متبادل سیاسی افق پر آشکار نہ پائے تو عمومی سماجی شعور پر رجعتی خیالات اور نظریات حاوی ہونے لگتے ہیں۔ محنت کش طبقہ، بالخصوص اس کی پسماندہ اور پچھڑی ہوئی پرتیں، سیاسی و ثقافتی طور پر پیٹی بورژوازی کی پیروی کرنے لگتی ہیں۔ دیومالائی قصے کہانیاں، توہمات اور تعصّبات عام ہو جاتے ہیں۔ مذہبیت لوگوں کے لباس، بات چیت اور رہن سہن میں سرایت کرنے لگتی ہے۔

(272) انقلابی تحریکوں کے دوران درمیانے طبقات یا پیٹی بورژوازی کے بہت سے حصے محنت کش طبقے کے پیچھے چلنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ بلکہ یوں کہیں کہ محنت کش طبقہ انہیں اپنے پیچھے کھینچ لیتا ہے۔ لیکن رجعتی یا غیر انقلابی حالات میں یہی پیٹی بورژوازی ایک طرف حکمران طبقات کی بھونڈی نقالی کی کوشش کرتی ہے۔ دوسری طرف حکمران طبقے اور ریاست کے رجعتی خیالات، تعصّبات، اقدار اور نظریات کو محنت کش طبقے میں سرایت کروانے کا باعث بنتی ہے۔ اس سلسلے میں صحافت، میڈیا اور تعلیمی نصابوں وغیرہ کا بھرپور استعمال کیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ درمیانہ طبقہ محنت کشوں پر اپنی تعلیمی قابلیت، نسبتاً مراعت یافتہ سماجی حیثیت اور کئی صورتوں میں مالکانہ پوزیشن کی وجہ سے بھی نفسیاتی طور پر حاوی ہوتا ہے۔ لیکن خود اس طبقے کی نفسیات ظاہریت پرستی، موقع پرستی اور توہم پرستی وغیرہ جیسے رجحانات پر مبنی ہوتی ہے۔ جو ناگزیر طور پر محنت کش طبقات کے شعور کو بھی زہر آلود کرنے کا باعث بنتے ہیں۔

(273) اسی طرح جلد بازی اور ''عملیت پسندی'' بھی ایسے پیٹی بورژوا رجحانات ہیں جن کے تحت کسی طویل اور صبر آزما جدوجہد کا حصہ بننا درمیانے طبقات کے افراد کے لئے بہت محال ہوتا ہے۔ یہ لوگ ہمیشہ فوری نتائج حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، غیر مشروط جوابات

ڈھونڈتے نظر آتے ہیں اور بہت سے سیاسی وسماجی معاملات کو بھی انتظامی نقطہ نظر سے دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں۔ بالخصوص ''پڑھے لکھے'' طبقات چونکہ حکمران طبقے کا انتظامی کام سنبھال رہے ہوتے ہیں اوران کی تعلیم وتربیت اسی انداز سے کی جاتی ہے لہٰذا ان میں یہ بیماریاں بھی بہت عام ہوتی ہیں۔جن کے خلاف انقلابی تنظیموں کو مسلسل جدوجہد کرنے کی ضرورت درپیش رہتی ہے۔

(274) پاکستان میں بنیاد پرستی کو ریاست نے ہمیشہ ایندھن اور پشت پناہی فراہم کی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کی معروضی بنیادیں بالکل ناپید ہیں۔غربت، محرومی، جہالت، اور پسماندگی کے حالات ایسے رجحانات کے لئے زرخیز زمین فراہم کرتے ہیں۔جسے کالے دھن اور ریاستی معاونت پر پلنے والے رجعتی عناصر بروئے کار لاتے ہیں اور محنت کش عوام کے شعور کو مزید پراگندہ اور مفلوج کرتے جاتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں پچھلے کچھ سالوں میں ایسے فرقے بھی تشدد، جبر اور دھونس کی جانب مائل ہوئے ہیں جو ماضی میں ''پرامن'' یا ''غیر سیاسی'' سمجھے جاتے تھے۔

(275) ایسے میں جماعت اسلامی (جو بڑی حد تک ایک مذہبی این جی او میں تبدیل ہو چکی ہے) جیسے پرانے بنیاد پرست رجحانات جہاں ٹوٹ پھوٹ اور زوال پذیری کا شکار ہوئے ہیں وہاں ٹی ایل پی جیسی مذہبی سیاست کی نئی شکلیں ابھری ہیں۔انتخابی سیاست میں بھی ٹی ایل پی نے جو نسبتاً بڑا ووٹ بینک تیزی سے حاصل کیا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ یہ پاکستان کی اکثریتی آبادی کے فرقے سے وابستہ ہے۔لیکن اس عمل میں پھر ریاستی چھوٹ اور سپانسرشپ نے بھی کلیدی کردار ادا کیا ہے۔اسی طرح بدعنوان، گماشتہ اور عوام دشمن لبرل یا مین سٹریم سیاست سے لوگوں کی بیزاری بھی ایسے عناصر کو تقویت دیتی ہے۔

(276) اسی طرح حالیہ سالوں میں ایسے ''ماڈرن'' قسم کے نوجوان ملاؤں کو بھی پذیرائی ملی ہے جو مذہب کی منطقی توجیہات پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔یہ رجحانات مغربی لباس و وضع قطع، انگریزی زبان اور سائنسی اصطلاحات وغیرہ کے تڑکے کے ساتھ انتہائی زہریلے قسم کی مذہبیت اور بنیاد پرستانہ نظریات کا پرچار کرتے نظر آتے ہیں۔ان میں خواتین بھی شامل ہیں اور

سوشل میڈیا پہ ان لوگوں کی آج کل بھرمار ہے۔ گزشتہ دہائیوں کی نیولبرل پالیسیوں سے جنم لینے والی شہروں کی پڑھی لکھی' اپ سٹارٹ مڈل کلاس خصوصی طور ان کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں ان کے پیروکاروں میں مغرب میں آباد اور شدید بیگانگی کا شکار پاکستانی تارکین وطن کی بڑی تعداد بھی شامل ہے۔ لیکن جدیدیت اور منطقی استدلال کے ڈھونگ کے باوجود ایسے رجحانات کی اساس اور سماجی کردار روایتی ملائیت سے مختلف نہیں ہے بلکہ بعض صورتوں میں یہ زیادہ رجعتی ثابت ہوتے ہیں۔

(277) لیکن مذہبی رجعت اور قدامت پرستی کی یہ قوتیں جہاں بعض اوقات حاوی ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں وہاں کم از کم پاکستان میں یہ خود کو فیصلہ کن طور پر مسلط کر کے تاریخ کا پہیہ واپس گھمانے کے قابل نہیں ہوئی ہیں۔ اس کے لئے بہت بڑے پیمانے کی تباہی و قتل و غارت گری پر مبنی ردِ انقلاب درکار ہے۔ لہٰذا غیر ہموار اور مشترک ترقی کے حامل ان سماجوں میں جدت اور ترقی پسندی کے رجحانات کمزور اور دبی ہوئی حالت میں ہی سہی لیکن پنپتے رہتے ہیں۔ لوگ ایک خاموشی اور بظاہر بے حسی کی حالت میں بھی ایک غیر محسوس انداز میں اسباق سیکھ رہے ہوتے ہیں اور نتائج اخذ کر رہے ہوتے ہیں۔ جو ان کے لاشعور میں مجتمع ہوتے جاتے ہیں۔ اسی طرح مزاحمتی تحریکیں بھی کسی نہ کسی سطح پر موجود رہتی ہیں۔ لیکن اس قابل نہیں ہو پاتیں کہ ایک جارحانہ جہت اختیار کرتے ہوئے معروضی حالات کو یکسر بدل کے رکھ دیں۔ ایسے میں مختلف شکلوں کی رجعت کے سیاہ بادل نہ صرف سیاسی و سماجی افق پہ چھائے رہتے ہیں بلکہ انقلابی تحریکوں کی تاخیر کی صورت میں گہرے بھی ہوتے جاتے ہیں۔

(278) ان حالات میں مذہبی بنیاد پرستی کے سیاسی رجحانات نسبتاً بڑا ہجم بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ جس سے محنت کش طبقے کی پسماندہ پرتیں بھی متاثر ہوتی ہیں۔ لیکن ماضی پرستی کی سیاہ قوتیں رنگ برنگے پیروں فقیروں اور مختلف فرقوں کے نوسر باز پیشواؤں کی شکل میں ہوں یا سیاست میں حصہ لینے والی مذہبی پارٹیوں صورت میں' ان کی سماجی حمایت زیادہ تر جزوی، سطحی اور معاشرے کی

پچھڑی ہوئی مخصوص پرتوں تک محدود ہی رہتی ہے اور آخری تجزیئے میں کسی انقلابی متبادل کی عدم موجودگی کا نتیجہ ہی ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں کسی قابل عمل معاشی وسماجی پروگرام سے عاری ہونے کی وجہ سے یہ جتنی تیزی سے ابھرتے ہیں اتنی ہی جلدی بیٹھ بھی جاتے ہیں۔

(279) اسی طرح حالیہ عرصے میں بنیاد پرستی کا منافقت، ریاستی آلہ کاری اور کالے دھن پر مبنی کردار بڑے پیمانے پر بے نقاب ہونے کی طرف بھی گیا ہے۔ اس میں خود حکمران سیاست کے داخلی تضادات کا بھی کردار ہے۔ انہی وجوہات کے تحت عمران خان کے دور میں ایک ملا کو سرکاری طور پر لانچ کرنے کی کوشش بری طرح ناکامی سے دوچار ہوئی ہے۔ اس سے قبل طاہر القادری کو ابھارنے کی کوششیں بھی ایسے ہی انجام کا شکار ہو چکی ہیں اور موصوف اب سیاست سے ہی تائب ہو گئے ہیں۔ وسیع تر آبادی کے سامنے ٹی ایل پی کی سیاست بھی ایک مضحکہ خیز کردار کی ہی حامل ہے۔

(280) لیکن موجودہ حالات میں ایسے رجعتی عناصر مسترد بھی ہوتے رہیں گے، ابھرتے بھی رہیں گے اور بعض صورتوں میں کسی حد تک مقبولیت بھی حاصل کرتے رہیں گے۔ تاہم طبقاتی کشمکش میں شدت ان کے بڑے پیمانے پر استرداد اور معدومیت کی راہ ہموار کرے گی۔

(281) مغربی معاشرے مخصوص تاریخی عوامل، جن میں بورژوا انقلابات، خونریز جنگوں اور نوآبادیات کی لوٹ مار کا کلیدی کردار ہے، کے تحت ترقی و خوشحالی کا طویل سفر طے کر کے سیکولر بنیادوں پر استوار ہوئے ہیں۔ اگرچہ آج وہاں بھی سرمایہ داری اپنی تاریخی حاصلات کو برقرار رکھنے سے قاصر نظر آتی ہے۔ لیکن یہ اِس خطے میں ایک جدید اور آسودہ حال سماج تعمیر کرنے میں سرمایہ داری کی تاریخی ناکامی کا اظہار ہے کہ آج ہندوستان جیسا سرکاری طور پر سیکولر ملک نہ صرف سیاسی و ریاستی بلکہ بڑی حد تک سماجی اور ثقافتی طور پر بھی ہندو بنیاد پرستی کے نرغے میں ہے۔ ہندوتوا کی اس یلغار کے خلاف اگرچہ مختلف محاذوں پر ایک مزاحمت بھی جاری ہے لیکن تاریخی طور پر زوال کے شکار نظاموں اور بدحالی سے دوچار سماجوں میں کسی انقلابی نظریئے اور پروگرام کے

بغیر صحت مند جمہوریت اور سیکولرازم کی استواری کے خواب دیکھنا نہ صرف خام خیالی ہے بلکہ اصلاح پسندی کا تاریخی جرم ہے۔

(282) ہندوستانی سماج کی اس رجعتی کیفیت کا بہت واضح اظہار ہمیں بالی ووڈ میں بھی نظر آتا ہے۔ جہاں انتہائی بھونڈی قسم کی ''مصالحہ'' فلموں کی بھرمار ہے جو کسی ٹھوس سماجی مواد اور موضوع سے یکسر عاری ہوتی ہیں اور جنہیں اربوں روپے کی اشتہار سازی کے ذریعے لوگوں کی نفسیات پر مسلط کیا جاتا ہے۔ فلموں کا بجٹ اور آمدن جوں جوں بڑھتی جارہی ہے ان کا معیار اسی طرح گرتا جارہا ہے۔ گرافکس، مہنگی لوکیشنز اور پرتعیش سرمایہ دارانہ معیارِ زندگی کی عکاسی کرنے والے مناظر کی بھرمار ہوتی ہے جن کے ذریعے عام لوگوں میں مقابلے بازی اور احساس کمتری کی سوچ پروان چڑھائی جاتی ہے اور انہیں نفسیاتی طور پر مرعوب کیا جاتا ہے۔ جبکہ سٹوری سے لے کے موسیقی اور ایکشن سے لے کے ڈائیلاگز تک سے جعلی پن، سطحیت اور بیہودگی ہی جھلکتی ہے۔ کردار انتہائی مبہم اور غیر واضح ہوتے ہیں جو کسی وقت کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ 'کیرکٹر ڈویلپمنٹ' نام کی یا تو کوئی چیز ہوتی نہیں ہے یا انتہائی مصنوعی اور یکلخت ہوتی ہے۔ جبکہ سب سے بیہودہ اور گھٹیا کردار عام طور پر ہیرو کا ہوتا ہے۔

(283) اس دوران دیکھنے کے قابل کچھ بہتر فلمیں بھی یقیناً تخلیق ہوئی ہیں لیکن عمومی رجحان ایسی فلموں کا ہی ہے جو پیٹی بورژوا نفسیات اور نقطہ نظر کی عکاسی کرتی ہیں۔ ان کے ذریعے حقیقی سماجی تضادات کو دبایا جاتا ہے اور مذہبی و قومی شاونزم کو ابھارا جاتا ہے۔ اسی قسم کا حال 'ویڈیو آن ڈیمانڈ' اور سٹریمنگ میڈیا پہ چلنے والے سیزنوں کا ہے جو جنسی ہیجان، تشدد اور گالم گلوچ کے ذریعے ناظرین کو متوجہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یوں فلم سازی آرٹ کی تخلیق کی بجائے ایک خالصتاً کمرشل سرگرمی بن چکی ہے جس کے پیچھے موضوعی مالیاتی و نظریاتی عوامل کے علاوہ معروضی سماجی انحطاط بھی کارفرما ہے۔ ایسے میں 1950ء اور 60ء کی دہائیوں میں ابھرنے والی متوازی یا 'پیرالل' سینما کی تحریک بھی 1990ء کی دہائی کے اوائل سے بڑی حد تک محدود اور زیادہ تر پوسٹ

ماڈرنسٹ موضوعات کا شکار ہوگئی ہے۔

(284) ضیاالحق کے دور کے بعد سے پاکستانی فلم انڈسٹری بھی اس سے ملتی جلتی کیفیات کے تحت اپنی موجودہ حالت تک پہنچی ہے۔ اس میں اگرچہ انتہائی سخت قسم کی ریاستی سنسرشپ اور رجعتی یلغار کا بھی کردار تھا لیکن معروضی طور پر محنت کش طبقے کی پسپائی اور مزدور تحریک کی زوال پذیری بھی ایک اہم عامل تھی۔ حالیہ سالوں میں اگرچہ نسبتاً اچھے معیار کی کچھ فلمیں بنی ہیں لیکن یہ سینما کی بڑے پیمانے پر بحالی میں ناکام رہی ہیں۔ علاوہ ازیں یہ فلمیں بھی زیادہ تر پوش قسم کے سینماؤں میں دکھائی جاتی ہیں جہاں مڈل کلاس ہی جاسکتی ہے۔

(285) یہاں ایک بڑی سماجی سرگرمی کے طور پر سینما بینی، جس میں محنت کش طبقات کی خاطر خواہ شمولیت ہو، کم وبیش ختم ہوچکی ہے جس میں جہاں فلموں کی دستیابی کے متبادل ذرائع کا کردار ہے وہاں عدم تحفظ کے احساس اور بیگانگی جیسے عوامل بھی کارفرما ہیں۔ گزشتہ چار دہائیوں کے دوران جس قسم کی گھٹیا فلموں کا چلن عام ہوا اور سینماؤں میں جو لمپن ماحول پروان چڑھا وہ جوڑوں یا فیملیوں کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ ایسے میں بہت سے تاریخی سینماؤں سمیت فلم بینی کے سینکڑوں مراکز شاپنگ مالوں اور پلازوں میں بدل چکے ہیں۔

(286) یہی حال ملک کی میوزک انڈسٹری کا ہوا ہے۔ مغربی موسیقی کی بات کریں تو 1980ء کی دہائی میں یہاں پاپ اراک میوزک کا بوم شروع ہوا جس میں چھوٹے بڑے درجنوں بینڈ اور گلوکار نمودار ہوئے جن میں کئی عالمی سطح پر بھی مقبول ہوئے۔ نازیہ حسن کا نام تو سوویت یونین کے نوجوانوں میں بھی زبان زدِ عام تھا۔ اس عرصے میں ان گنت معیاری دھنیں تخلیق ہوئیں۔ یہاں نہ صرف شہری سطح پر بڑے بلکہ علاقائی سطح پر بھی چھوٹے میوزک کنسرٹس کا رواج عام رہا ہے جن میں بڑی تعداد میں نوجوان شریک ہوا کرتے تھے۔ ایسے ایونٹ تعلیمی اداروں میں بھی منعقد ہوتے تھے۔ لیکن 2000ء کی دہائی کے وسط تک یہ رجحان بڑی حد تک دم توڑ چکا تھا۔ اس سلسلے میں سرکاری طور دہشت گردی کے خطرات کو جواز بنا کر ایسی سرگرمیوں کی حوصلہ شکنی کی گئی

(بالکل جیسے بسنت کو محفوظ بنانے کی بجائے ختم کرنے کی روش اپنائی گئی)۔لیکن معروضی طور پر بھی بڑھتی ہوئی مذہبیت، ہلڑ بازی اور خواتین میں عدم تحفظ کے احساس جیسی وجوہات کا کردار تھا۔ یہ کوئی اتفاق نہیں ہے کہ پاکستانی پاپ میوزک کے بیشتر بڑے نام بعد ازاں ملائیت کی طرف راغب ہو گئے۔حالیہ سالوں میں میوزک کنسرٹس کا سلسلہ اگرچہ دوبارہ شروع ہوا ہے لیکن یہ زیادہ تر 'ایلیٹ' تک ہی محدود ہیں۔

(287) ایک زمانے میں یہاں اردو اور پنجابی کے مزاحیہ سٹیج ڈراموں کی پوری انڈسٹری موجود تھی اور لاہور اور کراچی جیسے شہروں میں لوگ اپنے خاندانوں سمیت جوق در جوق یہ ڈرامے دیکھنے جایا کرتے تھے۔اس طنز و مزاح اور جگت بازی میں سماجی رویوں، مسائل اور عام انسانوں کی زندگیوں کی عکاسی بھی ہوتی تھی۔حتیٰ کہ سیاسی موضوعات کا احاطہ بھی کیا جاتا تھا۔لیکن آج اردو سٹیج کم و بیش معدوم ہو گیا ہے جبکہ پنجابی سٹیج ڈرامے جس بیہودگی اور گنوار پن کا شکار ہو چکے ہیں وہ بیان سے باہر ہے۔نتیجتاً جگت کو آج ایک منفی اصطلاح کے طور پر لیا جانے لگا ہے۔ یہ صورتحال ایک بار پھر کمرشلائزیشن کی اندھی دوڑ اور اس لمپنزم کی غماز ہے جو پاکستانی سرمایہ داری کی زوال پذیری کے ساتھ سماجی رویوں اور سوچوں میں سرایت کرتا گیا ہے۔حالیہ سالوں میں پنجابی سٹیج کے فنکاروں کی ٹی وی پروگراموں میں پیوندکاری کی کوشش کی گئی ہے جس نے ایک جعلی اور بھونڈے قسم کے امتزاج کو ہی جنم دیا ہے۔

(288) مشرف دور کے بعد سے نجی ٹی وی چینلوں کی بھرمار میں ٹی وی ڈراموں کی اگرچہ بہتات ہے جو ہندوستان سمیت کئی ممالک میں خاصے مقبول ہیں اور جن میں سماجی مسائل کو کسی حد تک چھیڑا جاتا ہے۔لیکن ایسا زیادہ تر پیٹی بورژوا نقطہ نظر سے ہی کیا جاتا ہے اور قدامت پرستانہ رویوں یا دقیانوسی روایات پر تنقید بھی اگر ہوتی ہے تو اس کا زاویہ لبرل ہوتا ہے۔ایک بات واضح ہے کہ نیولبرلزم کے ابھار کے بعد سے عام آدمی کے مسائل اور طبقاتی کشمکش پر مبنی موضوعات مین سٹریم فلم اور ڈرامہ وغیرہ سے غائب ہوتے گئے ہیں اور ان کی جگہ نئی ابھرنے والی مڈل کلاس کے

ایشوز اور ثقافت نے لے لی ہے۔

(289) حکمران طبقات کے اداروں سے یقیناً یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ وہ انقلابی آرٹ کے فروغ کا باقاعدہ کام شروع کر دیں۔ لیکن مذکورہ بالا بحث کا مطلب یہ ہے کہ حکمران طبقات خود بھی ایک ثقافتی گراوٹ کا شکار ہیں جو ان کے نظام اور زیر حکمرانی سماج کی زوال پذیری سے جڑی ہوئی ہے۔ جس سے مین سٹریم آرٹ کے جمالیاتی معیارات بھی گر گئے ہیں اور نہ صرف آرٹ کی فارم بلکہ اس کے اندر موجود مواد بھی انتہائی سطحی، ولگر اور جزوی طور پر بھی کسی ترقی پسندی سے عاری ہو چکا ہے۔ اسی طرح متوازی یا متبادل ذرائع سے انقلابی یا ترقی پسندانہ آرٹ کی تخلیق کے رجحانات اور مواقع میں بھی کمی آئی ہے۔ اگرچہ استثنائی صورتیں ہمیشہ موجود رہتی ہیں۔

(290) نیوز میڈیا کی بات کریں تو مشرف دور میں نجی چینلوں کی آمد سے کسی حد تک ریاستی پالیسیوں پر تنقید اور بحث مباحثے کی گنجائش پیدا ہوئی تھی۔ لیکن گزشتہ دس بارہ سالوں میں ریاستی جبر جس طرح بڑھتا گیا ہے اس میں میڈیا کو انتہائی سختی سے کنٹرول کی پالیسی اختیار کی گئی ہے جس کے نتیجے میں ان نیوز چینلوں کی صحافتی جان ہی نکل گئی ہے۔

(291) یہ بالکل درست ہے کہ کارپوریٹ نیوز میڈیا لوگوں کی سوچ اور رائے کی تشکیل کا ایک سرمایہ دارانہ اوزار ہوتا ہے جسے بڑی عیاری اور نفاست سے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس مقصد کے لئے پھر حکمران طبقات اور ریاستوں کو بولنے اور لکھنے کی کچھ چھوٹ بھی دینی پڑتی ہیں تاکہ اظہارِ رائے کی آزادی اور جمہوریت وغیرہ کے فریب برقرار رکھے جا سکیں۔ ریاست جس قدر اعتماد اور یکجائی سے اپنی حاکمیت سماج پر مسلط کرنے کے قابل ہوتی ہے' اس کی حکمرانی کے طریقہ کار اسی قدر 'پرامن' اور 'جمہوری' ہوتے ہیں۔ ان حالات میں ایک بالکل غیر مسلح پولیس والا بھی ریاستی رِٹ قائم کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ لیکن نظام کا بحران جب حالات کو وطن عزیز والی نہج پہ پہنچا دے تو طرح طرح کی سکیورٹی فورسز، آٹومیٹک رائفلوں اور ناکوں کی بھرمار بھی ناکافی ہو جاتی ہے۔ ایسے میں صحافتی آزادیاں بھی اس قدر سکڑ جاتی ہیں کہ میڈیا عملاً ریاستی 'ماؤتھ پیس' بن جاتا

ہے اور بیشتر صورتوں میں نجی و سرکاری چینلوں میں فرق کرنا محال ہو جاتا ہے۔ اس وقت ملک میں گنتی کے دو یا تین پروگرام ایسے بچے ہیں جن سے تھوڑے معقول تجزیئے اور کسی حد تک سرکاری بیانیے کے خلاف جانے کی توقع کی جا سکتی ہے۔

(292) یہی وجہ ہے کہ سنجیدہ بورژوا تجزیہ نگاری کے حوالے سے بھی پاکستان کے نیوز چینل اپنی افادیت بڑی حد تک کھو چکے ہیں۔ نتیجتاً ان کی مقبولیت میں بھی بڑی کمی واقع ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کم و بیش ہر بڑے صحافی نے یوٹیوب اور سوشل میڈیا کا رُخ کیا ہے اور لوگوں میں بھی ٹی وی سے زیادہ وی لاگز دیکھنے کا رجحان بڑھا ہے۔ لیکن پھر ان وی لاگز میں بھی ڈیپ سٹیٹ اور مختلف سیاسی پارٹیوں (بالخصوص تحریک انصاف اور ن لیگ) کی بڑی مداخلت موجود ہے جس میں خبریں بھی پلانٹ کروائی جاتی ہیں اور مخالفین کے خلاف صحافت کے تمام اصولوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے افواہوں اور پراپیگنڈا کا بازار بھی گرم کیا جاتا ہے۔

(293) بہر حال ایک مارکسی تناظر کی تخلیق میں بھی بورژوازی کی سنجیدہ صحافت کو مدنظر رکھنا انتہائی ضروری ہوتا ہے۔ جس کے لئے تجزیوں اور خبروں کے 'بین السطور' ادراک کا فن بنیادی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ اسی طرح سخت سنسر شپ اور کنٹرول کے باوجود بھی مین سٹریم میڈیا میں انقلابی پراپیگنڈا کے کچھ نہ کچھ مواقع مل سکتے ہیں جن سے فائدہ اٹھایا جانا چاہئے۔

(294) گزشتہ ایک ڈیڑھ دہائی میں براڈ بینڈ انٹرنیٹ کے عام ہونے کے ساتھ پاکستان جیسے پسماندہ ممالک میں بھی سوشل میڈیا کا استعمال تیزی سے بڑھا ہے۔ اس وقت ملک کی 83 فیصد آبادی موبائل فون جبکہ 56 فیصد براڈ بینڈ انٹرنیٹ استعمال کر رہی ہے۔ یہ غیر ہموار اور مشترک ترقی کی ایک اور شکل ہے کہ بنیادی ترین ضروریات زندگی سے محروم آبادی کے انتہائی مفلس اور خستہ حال حصے بھی انٹرنیٹ سے جڑے ہوئے ہیں۔ یہ یقیناً گہرے سیاسی و سماجی مضمرات کا حامل مظہر ہے۔

(295) لیکن سوشل میڈیا کے سیاسی یا سماجی کردار کے حوالے سے بھی بہت سی غلط فہمیاں

پائی جاتی ہیں۔ مثلاً نہ صرف لبرل بلکہ بائیں بازو کے اصلاح پسندانہ حلقوں کی جانب سے بھی سوشل میڈیا کو عمومی سماجی پراسیس کے نعم البدل کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ یعنی اسے ایک ایسا معجزاتی میڈیم سمجھا جاتا ہے جو سماجی و سیاسی عوامل سے ماورا ہو کے معاشرے کو آگے بڑھا سکتا ہے یا مثبت تبدیلیاں پیدا کر سکتا ہے۔ اس حوالے سے پندرہویں صدی میں پرنٹنگ پریس کی ایجاد کی مثال دی جاتی ہے جس نے مبینہ طور پر یورپ میں جاگیرداری اور پاپائیت کے خاتمے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ حالانکہ پرنٹنگ پریس آسمان سے نہیں اتری تھی بلکہ اس تکنیکی ترقی کی پیداوار تھی جو جاگیرداری کے بطن میں ایک نئے نظام کی ابتدائی تشکیل کرنے والے وسیع تر سماجی عمل کا حصہ تھی۔ یوں پرنٹنگ پریس نے جاگیرداری مخالف بورژوا انقلابی نظریات اور رجحانات، جو اس عہد میں عوامی مقبولیت حاصل کر رہے تھے، کو شروع نہیں کیا بلکہ ان کو مہمیز ہی دی۔ دوسرے الفاظ میں اس نے پہلے سے جاری ایک سماجی پراسیس کو تیز تر کر دیا۔

(296) اس تناظر میں سوشل میڈیا کو کنٹرول کرنے والی کمپنیوں یا اداروں کو بالکل ''نیوٹرل'' بھی مان لیا جائے تو یہ معاشرے کی عمومی صورتحال کی عکاسی ہی پیش کرے گا۔ مثلاً آج ہندوستان یا پاکستان کی بات ہی کی جائے تو کوئی ترقی پسندانہ، منطقی یا سائنسی بات کرنے والے چینلوں یا پیجز سے کئی گنا زیادہ بھرمار بکواسیات اور رجعت کی ہے۔ جس میں طرح طرح کے پیروں فقیروں، مولویوں اور حکیموں کے ساتھ ساتھ سرمایہ دارانہ سیاسی پارٹیوں اور ریاستوں کے وسیع و عریض نیٹ ورکس اور مغلظات بکنے والے وی لاگز وغیرہ شامل ہیں۔ سوشل میڈیا پر بھی پیسہ چلتا ہے اور ان ذرائع کے پاس اپنی مشہوری اور پراپیگنڈا کے لئے بے شمار سرمایہ موجود ہے جسے لگا کے پھر مزید پیسہ کمایا جاتا ہے۔

(297) حالیہ سالوں میں ٹک ٹاک وغیرہ کی مشہوری کے ساتھ سوشل میڈیا کے ذریعے راتوں رات امیر اور مشہور ہونے کی دوڑ بھی لگی ہے جس کے لئے پھر بیہودگی اور بے تکے پن کی ہر حد کو پار کیا جاتا ہے (جس طرح 'ای کامرس' کے ذریعے جلد امیر بننے کا ایک فریب نوجوانوں کے

لئے تخلیق کیا گیا ہے)۔لیکن اس سب سے ہٹ کے بھی یہ سوشل میڈیا جن ذرائع کی ملکیت اور کنٹرول میں ہے وہ اسی سامراجی سرمایہ دارانہ نظام کے ہی رکھوالے ہیں اور اسی تناظر میں ان پلیٹ فارمز کی پالیسیاں تشکیل دی جاتی ہیں۔ حالیہ سالوں میں بالخصوص فیس بک اور انسٹاگرام وغیرہ کو''غیر سیاسی'' بنانے کی کوششوں میں تیزی آئی ہے جس کے لئے انقلابی واحتجاجی مواد پر مبنی پوسٹوں، پروفائلوں اور پیجز وغیرہ کی 'ریچ' کو محدود کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔بعض صورتوں میں انہیں یکسر بند ہی کر دیا جاتا ہے۔فلسطین پر اسرائیلی جارحیت نے اس ساری واردات کو کھل کے بے نقاب کیا ہے۔

(298) تاہم اس طوفان بدتمیزی کے باوجود بھی سوشل میڈیا پر معقول بات کرنے والے لوگ مل جاتے ہیں اور کچھ نہ کچھ پذیرائی بھی پاتے ہیں۔ اسی طرح عام لوگوں کے دلوں کو چھو جانے والی احتجاجی و باغی آوازیں اور نعرے بھی بعض اوقات حیرت انگیز مقبولیت حاصل کر لیتے ہیں اور حکمران طبقات پر دباؤ کا موجب بنتے ہیں۔ حالیہ عرصے میں اٹھنے والی مزاحمتی تحریکوں نے بھی ابلاغ کے ان جدید ذرائع کا خاطر خواہ سیاسی استعمال کیا ہے۔ بہرحال مین سٹریم میڈیا کی طرح سوشل میڈیا کو بھی مخصوص حدود و قیود میں ہی انقلابی کام اور پراپیگنڈا کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے اور یہ عملی جدوجہد اور تنظیم سازی کا متبادل نہیں بن سکتا۔

(299) تاہم آج کل نوجوانوں میں سوشل میڈیا کا ضرورت سے زیادہ استعمال ایک بیماری کی شکل بھی اختیار کر گیا ہے جس میں روزانہ کئی کئی گھنٹے 'سکرولنگ' اور 'ریلز' دیکھنے میں صرف کر دیئے جاتے ہیں۔حتیٰ کہ انتہائی کم عمر بچوں میں بھی یہ عادت عام ہوتی جا رہی ہے۔اس سے زیادہ غور و فکر، دھیان اور وقت کی متقاضی سرگرمیاں، جو تھوڑے صبر اور ٹھہراؤ کا تقاضا کرتی ہیں اور جن کا نعم البدل اس جدید دور میں بھی کوئی نہیں ہے، بہت کم ہونے کی طرف گئی ہیں۔ ان میں سرفہرست مطالعہ ہے۔

(300) سوشل میڈیا کو گھنٹوں سکرول کرنے کی عادت انسان کو جس ذہنی کیفیت میں لے

جاتی ہیں اس میں دستاویزی یا فیچر فلمیں دیکھنا بھی محال ہو جاتا ہے اور تھوڑی ہی دیر بعد اکتاہٹ شروع ہو جاتی ہے۔ اس سے تنہائی پسندی اور خود کو دنیا سے کاٹ لینے کی نفسیات بھی جنم لیتی ہے۔ لیکن اس صورتحال کی بنیادی وجہ پھر تفریح کے متبادل اور صحت مندانہ ذرائع کی قلت ہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ وقت کے ساتھ ایسی سماجی و ثقافتی سرگرمیاں جن سے لوگ اجتماعی طور پر محظوظ ہو کے ایک دوسرے کے قریب آسکیں' ناپید ہوتی گئی ہیں جس سے سماجی بیگانگی میں اضافہ ہی ہوا ہے۔ اور ان حالات کی تشکیل میں 'پیرانایا' (دوسروں پر شک اور خود کو مسلسل غیر محفوظ محسوس کرنے کی بیماری) کا شکار ریاست نے اپنی گھٹن، رجعت اور جبر پر مبنی پالیسیوں کے ذریعے حصہ بقدر جثہ ڈالا ہے۔

(301) اس ثقافتی گراوٹ اور بیگانگی کا ایک اور اظہار 'لٹرنگ' یا کوڑا کرکٹ اِدھر اُدھر پھینکنے کی عادت کی شکل میں بھی ہوتا ہے۔ یہ اس بات کا واضح اظہار ہوتا ہے انسان اپنی ذات یا گھر کو اپنے اردگرد کی فطرت یا معاشرے کا حصہ ہی نہیں سمجھتا۔ آج نہ صرف شہر اور دیہات بلکہ پرفضا پہاڑی مقامات بھی پلاسٹک کی بوتلوں اور شاپروں وغیرہ سے اٹے نظر آتے ہیں جس نے فطرت کے حسن کو مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔ صنعتوں کے فضلے کو ٹھکانے لگانے کے وسائل ہیں نہ بندوبست۔ یہ زہر بھی مسلسل فضا اور پانی میں شامل ہو رہا ہے۔ بڑے شہروں میں ویسٹ مینجمنٹ کا سنجیدہ بحران ہے۔ خالی پلاٹوں اور سڑکوں کے کناروں پہ کوڑے کے پہاڑ بنتے چلے جاتے ہیں جنہیں کوئی اٹھانے والا نہیں ہے۔ سات دہائیوں میں ان شہروں کو دھول اور مٹی سے بھی پاک نہیں کیا جا سکا۔ یہ دھول سارا دن ٹریفک کے ساتھ اڑتی ہے۔ خوراک میں شامل ہوتی ہے۔ لوگوں کی آنکھیں، ناک اور کان اس سے بھر جاتے ہیں اور دھلے ہوئے کپڑے چند منٹوں میں میلے ہو جاتے ہیں۔ یہاں انسان کی عزت نفس، اعتماد اور شخصیت کو مجروح کرنے کے لئے یہ دھول ہی کافی ہے۔ گزشتہ کچھ سالوں سے یہ سموگ کے اجزا میں بھی شامل ہو چکی ہے۔

(302) لیکن اس سموگ کی بنیادی وجہ پھر گاڑیوں کا دھواں ہے۔ نجی ٹرانسپورٹ کی بھرمار ہوتی جا رہی ہے جس کی وجوہات میں پھر گاڑیوں اور پٹرولیم کی صنعت کی منافع خوری، شہروں کا

بے ہنگم پھیلاؤ اور پبلک ٹرانسپورٹ کا فقدان شامل ہے۔ انسانی صحت پر انتہائی مضر اثرات مرتب کرنے والی یہ سموگ اب چند شہروں سے بڑھ کے پورے ملک' بلکہ پورے خطے کا مسئلہ بن چکی ہے۔ اسی طرح بڑے شہروں میں ٹریفک جام، شور اور حادثات جیسے مسائل نے زندگیوں کو اجیرن کیا ہوا ہے۔ اس ٹریفک کو گزارنے کے لئے پھر بیش قیمت درختوں کو کاٹ کے سڑکیں چوڑی کی جاتی ہیں اور انڈر پاس وغیرہ بنائے جاتے ہیں۔ جس سے شہر کنکریٹ کے جنگل بن گئے ہیں جو گرمیوں میں تپنے لگتے ہیں۔ آبادی بڑھتی جا رہی ہے لیکن ریاستی سرمایہ کاری کے فقدان کی وجہ سے بنیادی سماجی اور مادی انفراسٹرکچر زبوں حالی کا شکار ہے۔ یوں اس ساری اربنائزیشن اور ''ترقی'' نے ایسے انتشار، نفسانفسی اور تعفن کو جنم دیا ہے جس نے زندگیوں کو سہل بنانے کی بجائے اور زیادہ ہیجان، تلخی اور پریشانی کا شکار کر دیا ہے۔

(303) پاکستان گلوبل وارمنگ اور ماحولیاتی تبدیلیوں کے شکار ممالک میں سرفہرست ہے جس کے اثرات نہ صرف سموگ بلکہ سیلابوں، شدید گرمی کی لہروں، بارشوں اور برفباری کے پیٹرن میں تبدیلیوں اور موسموں کی شفٹ کی صورت میں واضح نظر آ رہے ہیں۔ آنے والے دنوں میں یہ تبدیلیاں زیادہ شدت اختیار کر کے بڑے بحرانوں اور تباہ کاریوں کا موجب بن سکتی ہیں۔

(304) نئی نسل کا ایک اور بڑا مسئلہ کھیلوں اور دوسری جسمانی سرگرمیوں سے محرومی بھی ہے۔ جس کے نہ صرف جسمانی بلکہ ذہنی و نفسیاتی مضمرات بھی ہیں۔ اس کا الزام ایک بار پھر کمپیوٹر اور موبائل وغیرہ کو دیا جاتا ہے حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ بیشتر بچے اور نوجوان موبائل وغیرہ میں اس لئے گھسے رہتے ہیں کیونکہ ان کے پاس کوئی متبادل جسمانی سرگرمی نہیں ہوتی۔ جس کی پھر مزید کئی وجوہات ہیں۔ مثلاً شہروں میں بے ہنگم تعمیرات کے رجحان سے سبزہ، پارک اور کھیلوں کے میدان تیزی سے ناپید ہونے کی طرف گئے ہیں۔ کراچی میں تو کھلے میدانوں پر راتوں رات عمارتیں یا پلازے کھڑے کرنے والا پورا مافیا پروان چڑھا ہے۔ جا بجا کوٹھیوں میں کھلے نجی سکول کالج بھی ایسی کھلی جگہوں سے عاری ہوتے ہیں جہاں طلبہ بھاگ دوڑ سکیں۔ جبکہ

سرکاری تعلیمی اداروں کی وسیع زمینوں پر لینڈ مافیا کی للچائی نظریں ٹکی ہوئی ہیں۔

(305) لیکن اس سلسلے میں کھیل کی جگہوں کے فقدان سے بھی بڑی وجہ یہ ہے والدین خود بچوں کو گھر سے باہر نہیں جانے دینا چاہتے۔ جس کے پیچھے اولاد کے حوالے سے شدید عدم تحفظ کا احساس کارفرما ہے۔ کیونکہ اس سرمایہ دارانہ معاشرے کے بحران کا ایک خوفناک اظہار معصوم بچے بچیوں پر جنسی درندگی کے قبیح واقعات میں اضافے سے بھی ہے۔ اسی طرح اغوا برائے تاوان جیسے جرائم بھی بڑھے ہیں۔ اس سب سے ہٹ کے بھی والدین کو بچوں کے بری صحبت کا شکار ہو جانے کا خوف رہتا ہے۔ جس میں منشیات کا بڑھتا ہوا رجحان بھی شامل ہے۔ ایسے میں والدین کی کوشش ہوتی ہے کہ بچے گھر میں جو بھی کرتے رہیں لیکن ان کی جان اور عصمت محفوظ رہے۔

(306) اس سارے معاملے کو جوائنٹ فیملی سسٹم کی ٹوٹ پھوٹ کے تناظر میں بھی دیکھنے کی ضرورت ہے۔ خاندان کی ان پرانی اور مشترکہ شکلوں میں بہت سے بچے ایک ساتھ پلتے بڑھتے تھے اور وقت کا بڑا حصہ ایک دوسرے کے ساتھ کھیل کود میں گزارتے تھے۔ یوں وہ مسلسل ایک اجتماعی سرگرمی میں مصروف رہتے تھے۔ ان کی دیکھ بھال کا کام بھی بہت سے لوگوں میں بٹ جاتا تھا۔ لیکن نیوکلیئر فیملیوں میں ایک تو وہ اپنے کزنوں سے دور ہو گئے ہیں۔ دوسرا اربنائزیشن کے ساتھ بچے پیدا کرنے کا رجحان بھی کم ہوا ہے۔ مہنگی تعلیم اور ضروریات زندگی کے دور میں والدین کی کوشش ہوتی ہے کہ ایک یا دو بچوں کے ساتھ ہی خاندان کو مکمل کر لیا جائے۔ ان حالات میں بچے شدید تنہائی اور بوریت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جس کا اظہار وہ والدین بالخصوص ماؤں کو مختلف طریقوں سے تنگ کر کے بھی کرتے ہیں۔ نتیجتاً انہیں موبائل، کمپیوٹر یا ٹی وی وغیرہ کے ذریعے مصروف رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

(307) اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جوائنٹ فیملی سسٹم کوئی بڑا آئیڈیل خاندانی نظام ہے۔ بلکہ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ سرمایہ داری نے جہاں پرانی سماجی شکلوں کو توڑ پھوڑ دیا ہے وہاں وہ ان کا کوئی خاطر خواہ متبادل فراہم کرنے میں ناکام رہی ہے۔ یہ مسئلہ پاکستان جیسے تاخیر زدہ معاشروں

میں زیادہ شدت سے موجود ہے۔ یہاں ایک طرف اربنائزیشن کا عمل تیزی سے جاری ہے جس کی وجہ سے بالخصوص شہروں میں مشترکہ خاندانوں کی گنجائش بہت کم بچی ہے۔لیکن جن خطوں میں یہ پرانی خاندانی شکلیں بچی ہیں وہاں بھی سرمائے نے رشتوں میں زہر گھول کے بہت سی تلخیوں کو جنم دیا ہے۔ بہرحال سماج کی ایک انقلابی ٹرانسفارمیشن خاندان کی تمام قدیم شکلوں کے مثبت پہلوؤں کو ایک بلند تر پیمانے پہ یکجا کرے گی۔

(308) تاریخ کے اتار چڑھاؤ کے عمل میں محکوم اور استحصال زدہ پرتوں میں طبقاتی پہچان کا ادراک اور اس سے جڑا سماج کی انقلابی تبدیلی کا تاریخی نصب العین جب ماند پڑ جائے تو شناخت کے بحران اور بیگانگی کی ایسی کیفیات میں لوگ رجعتی قسم کی گروہی نفسیات کا شکار بھی ہو جاتے ہیں۔جس میں پھر وہ مذہبی فرقوں، ذات پات، قوم اور نسل وغیرہ کی شناختوں میں پناہ تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

(309) محنت کشوں کی یکجہتی میں دراڑیں ڈالنے والے ان تعصبات کو پھر حکمران طبقات اور پیٹی بورژوازی کے جغادری مختلف نسلی، مذہبی اور قوم پرستانہ شکلوں میں استعمال کرتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے محنت کش طبقات میں دوسری نسلوں یا مذہبوں کے لوگوں کے حوالے سے عدم تحفظ کا احساس ابھارا جاتا ہے اور نفرتوں کو ہوا دی جاتی ہے۔ بالخصوص معاشی بحران کے ادوار میں ایسے رجحانات کے پنپنے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔جیسا کہ ہم آج ترقی یافتہ مغرب میں بھی نسل پرستی اور دوسری شکلوں میں انتہائی دائیں بازو کا ابھار دیکھ رہے ہیں۔اسی قسم کی صورتحال ہمیں یہاں افغان مہاجرین کے معاملے پر بھی کچھ زہریلے قوم پرست عناصر کی طرف سے نظر آئی ہے۔

(310) ایسے حالات مقدس خاندانی رشتوں کو بھی مطلب و مالیاتی مفاد کا زہر گھول کے کھوکھلا کر دیتے ہیں جس سے خاندان کی ٹوٹ پھوٹ کے ساتھ ساتھ خواتین اور بچوں پر تشدد میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ خواتین کی زندگیاں یہاں دہرے تہرے عذابوں اور اذیتوں کا شکار ہیں۔ پاکستان میں حالیہ کچھ سالوں میں گھریلو تشدد اور طلاقوں کی شرح میں خاصا اضافہ ہوا ہے جس میں

ایک بار پھر تلخ معاشی حالات کا کلیدی کردار ہے۔ جن میں پھر جائیدادوں کی تقسیم پر جھگڑے، قتل و غارت اور کورٹ کچہریاں ایک سماجی معمول بن گئی ہیں۔ ملک کی تیز اربنائزیشن نے جوائنٹ فیملی سسٹم کو بڑی حد تک توڑ پھوڑ دیا ہے۔ لیکن اس کے متبادل خاندانی وسماجی اداروں کی تشکیل وسائل کی قلت کی وجہ سے ادھورے پن اور تلخیوں کا شکار ہے۔ اسی طرح خواتین کیساتھ ساتھ معصوم بچوں کے ریپ اور قتل کے اندوہناک واقعات آئے روز رپورٹ ہوتے ہیں۔ بڑے شہروں میں سٹریٹ کرائم ایک وبائی صورتحال اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ لیکن یہ سب سماج کو لاحق گہری بیماری کی مختلف علامات ہی ہیں۔

(311) گزشتہ دو سے تین دہائیوں میں خواتین میں ''پردہ'' کرنے کے رجحان میں اضافہ ہوا ہے۔ جس کے پیچھے مذہبیت کے ساتھ ساتھ خواتین میں شدید عدم تحفظ کا احساس بھی کارفرما ہے۔ اس عرصے میں خواتین کی ہراسانی کا رجحان بڑھا ہے جس کی گھورنے سے لے کر چھونے، آوازیں کسنے اور پیچھا کرنے تک کئی صورتوں اور شدتیں ہوسکتی ہیں۔ یہ صورتحال ان معاشروں میں پدرشاہی کے غلبے کے ساتھ ساتھ شدید جنسی فرسٹریشن اور ہیجان کی غمازی کرتی ہے۔ لیکن اس سے ہٹ کر بھی گھر سے تعلیم یا جاب وغیرہ کے لئے نکلنے والی خواتین (بالخصوص اگر وہ نقاب وغیرہ نہیں کرتی ہیں) کے کردار پر شک کرنے کی غلیظ نفسیات وسیع پیمانے پر پائی جاتی ہے جو بظاہر 'ماڈرن' اور پڑھے لکھے مردوں میں بھی موجود ہوسکتی ہے۔ ویسے کردار کے پاکیزہ یا خراب ہونے کے حوالے سے بھی اس معاشرے کے معیارات انتہائی دوغلے اور گھٹیا ہیں۔

(312) اگرچہ آج ماضی کی نسبت کہیں زیادہ خواتین پڑھنے یا نوکریاں کرنے کے لئے چار دیواری سے باہر آ رہی ہیں لیکن ان میں سے بیشتر کو پھر والدین یا بھائیوں کی طرف ''خاندان کی عزت'' اور ''غیرت'' محفوظ رکھنے کی قسمیں اور واسطے دیئے جاتے ہیں۔ جس سے یہ خود کو اور بھی غیر محفوظ محسوس کرتی ہیں اور ان کا اعتماد بری طرح مجروح ہو جاتا ہے۔ یہ ایک بار پھر جدت اور پسماندگی کے ٹکراؤ سے جنم لینے والا عجیب وغریب تضاد ہے۔ تعلیمی اداروں میں طالبات کی

ہراسانی اور جنسی استحصال کا رجحان بڑے پیمانے پر موجود ہے جن میں اساتذہ، انتظامیہ اور نام نہاد اشرافیہ کے لوگ ملوث ہوتے ہیں۔ حالیہ سالوں میں طالبات کی خودکشیوں کے مشکوک واقعات بھی سامنے آئے ہیں جن کے بارے میں غالب گمان یہی ہے کہ ان معصوم بچیوں کی زبان ہمیشہ کے لئے بند کرنے کو انہیں قتل کیا گیا (یا بلیک میلنگ کے ذریعے خودکشی پہ مجبور کر دیا گیا)۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایسی پابندیوں اور ہراسانی کا زیادہ تر شکار پھر محکوم اور لوئر مڈل کلاس پرتوں کی خواتین ہی ہوتی ہیں۔ جس کی وجہ ان کا کمزور طبقاتی و معاشی پس منظر ہے۔ جبکہ اثر و رسوخ والے خاندانوں کی خواتین کے سامنے بڑے بڑے مردوں کی بولتی بند ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں ایسے خاندان اپنے بیشمار پیسے سے ''عزت'' اور ''غیرت'' خریدنے کی سکت بھی رکھتے ہیں۔

(313) یہ معاشی و معاشرتی بحران نوجوانوں کو زیادہ نفسیاتی کرب میں اس لئے مبتلا کر دیتا ہے کہ ایک تو وہ حساس، توانائی سے بھرپور اور بدعنوانی کی سوچ سے نسبتاً پاک ہوتے ہیں۔ دوسرا ان کے سامنے پوری زندگی پڑی ہوتی ہے۔ ویسے تو اس ملک میں دو کروڑ سے زائد بچے ابتدائی تعلیم سے بھی محروم ہیں اور محنت کش طبقات کے بچوں کی وسیع اکثریت کو یا تو بچپن سے ہی محنت مزدوری کی چکی میں پسنا پڑتا ہے یا وہ سکول کی صرف ابتدائی تعلیم ہی حاصل کر پاتے ہیں۔ ایسے میں کالجوں اور یونیورسٹیوں تک زیادہ تر مڈل کلاس کے نوجوانوں کی رسائی ہی ہو پاتی ہے۔ لیکن یہ نسبتاً مراعت یافتہ نوجوان بھی ذہنی، معاشی اور سماجی طور پر مسلسل کشمکش کا شکار رہتے ہیں۔

(314) جس معاشرے میں چار دہائیوں سے طلبہ یونین پر پابندی ہو، سیاست کو ایک گالی بنا دیا گیا ہو، نظریاتی بحث کو دبا دیا گیا ہو، مذہبی رجعت کو تعلیمی اداروں سمیت پورے معاشرے پر مسلط کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی گئی ہو اور نئی نسل کی صلاحیتوں کے تخلیقی اور تعمیری اظہار کے راستے مسدود کر دیئے گئے ہوں، وہاں طلبہ کس قدر پژمردگی اور بیگانگی کا شکار ہوں گے اس کا اندازہ لگانا محال نہیں ہے۔ اس ملک میں ایک طرف زیادہ سے زیادہ نمبروں اور پوزیشنوں کی ریکارڈ قائم ہو رہے ہیں جبکہ دوسری طرف تخلیقی صلاحیتیں مسلسل روبہ زوال ہیں۔

(315) تعلیم جوں جوں منافع خوری اور نجکاری کے شکنجے میں جاتی گئی ہے' اس کا معیار مسلسل گراوٹ کا شکار ہوا ہے۔ کوئی نئی بات سیکھنے، منطقی طور پر سوچنے، دنیا کو سمجھنے اور بہتر بنانے کی بجائے ڈگریوں کا حصول ساری تعلیمی سرگرمیوں کا مطمع نظر بنا دیا گیا ہے۔ یونیورسٹیاں کے ماحول کو گھٹن اور جبر سے آلودہ کر کے انہیں ایسی جیلوں میں تبدیل کر دیا گیا ہے جہاں ہر قسم کی تنقیدی سوچ اور یکجہتی کے احساسات کو صنعتی پیمانے پر قتل کیا جاتا ہے۔ اس مقصد کے لئے بورژوا نصابوں اور ڈسپلن کی دھونس' دونوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔

(316) پرائیویٹ یونیورسٹیاں تو مہنگی ہیں ہی لیکن تعلیم کے سرکاری بجٹ میں کمی کی وجہ سے سرکاری یونیورسٹیوں کی فیسوں میں بھی مسلسل اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ ہاسٹلوں اور ٹرانسپورٹ کی سہولیات انتہائی ناکافی ہیں جنہیں بیشتر صورتوں میں مہنگے داموں خریدنا پڑتا ہے۔ یوں یونیورسٹی کی تعلیم والدین کی جیبوں پر بھاری بوجھ کا باعث بنتی ہیں۔ جس کے بعد وہ اولاد سے وصولی کے متمنی ہوتے ہیں۔ لیکن پھر نوکریوں کی انتہائی قلت' بلکہ ناپیدگی کے ماحول میں دھکوں کے ایک نئے سلسلے کا آغاز ہوتا ہے۔ جس میں یونیورسٹیوں سے فارغ التحصیل نوجوانوں سے ہنرمند مزدور کی تنخواہ سے بھی کم پر کام لیا جاتا ہے۔ جبکہ بعض صورتوں میں 'انٹرن شپ' کے نام پر بیگار کاٹنی پڑتی ہے۔

(317) تعلیم سے لے کر نوکری تک مسلسل مقابلہ بازی کی دوڑ، حال کی تنگی اور مستقبل کی غیر یقینی نوجوانوں کی شخصیت کو مسخ کر کے رکھ دیتی ہے۔ بالخصوص ایسے حالات میں جب دنیا کو دیکھنے اور بدلنے کی جدوجہد کرنے کا کوئی انقلابی نظریہ میسر نہ ہو پائے۔ یہ کیفیت پھر ہر طرح کے سماج دشمن رویوں کو جنم دیتی ہے جس میں جرائم اور منشیات کے ساتھ ساتھ بہت سے نوجوان ملائیت اور بنیاد پرستی میں آسرا تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی طرح یہ حالات انگزائٹی اور ڈپریشن جیسے نفسیاتی عارضوں کا بھی باعث بنتے ہیں جن سے بڑی تعداد میں نوجوان متاثر ہو رہے ہیں اور جو بعض اوقات خودکشی کی نہج تک بھی لے جاتے ہیں۔

(318) اس سب کے باوجود نئی نسل میں مروجہ نظام سے بیزاری اور بغاوت کے جذبات

بڑے پیمانے پہ موجود ہیں۔شعوری یا لاشعوری طور پر انقلابی تبدیلی کی خواہش بھی مختلف صورتوں میں اپنا اظہار کرتی رہتی ہے۔نیم رجعتی معروض،نظریاتی سیاست کے فقدان اور کسی انقلابی متبادل کے سماجی افق پر نمودار نہ ہونے کے حالات میں اس تڑپ نے اپنا اظہار تحریک انصاف کی حمایت کے ذریعے ایک مسخ شدہ اور منفی صورت میں کیا ہے۔لیکن آنے والے دنوں میں یہی امنگیں انقلابی جہت بھی اختیار کر سکتی ہیں۔

(319) محکوم قوموں اور پسماندہ خطوں سے تعلق رکھنے والے طلبہ میں سیاسی تحرک،نظریاتی بحث اور ایجی ٹیشن کے رجحانات زیادہ مضبوط ہیں۔یہی وجہ ہے کہ پچھلے عرصے میں گلگت بلتستان سے کشمیر اور سرائیکی خطے سے بلوچستان تک یونیورسٹیوں میں جنسی ہراسانی سمیت مختلف مسائل کے گرد چھوٹی بڑی احتجاجی تحریکیں نظر آئی ہیں۔اسی طرح ان خطوں کی قومی تحریکوں میں بھی نوجوانوں کا ایک ہراول کردار موجود ہے۔

(320) لیکن رجعت کا گڑھ سمجھی جانے والی پنجاب یونیورسٹی جیسے نسبتاً ترقی یافتہ شہری مراکز کے تعلیمی اداروں میں بھی گزشتہ کچھ سالوں میں ایک اہم پیش رفت یہ ہوئی ہے کہ جمعیت جیسی بنیاد پرست قوتیں بڑے پیمانے پر استرداد کا شکار ہوئی ہیں۔یہ گروہ اب یونیورسٹی انتظامیہ اور ریاست کی بھرپور پشت پناہی کے باوجود خود کو ماضی کی طرح مسلط کرنے کے قابل نہیں ہیں۔فرسٹریشن کے عالم میں یہ رجعتی عناصر لڑائی جھگڑوں اور تشدد وغیرہ کا سہارا لینے کی کوشش کرتے ہیں لیکن سماج میں مذہبیت اور قدامت پسندی کے رجحانات کے باوجود طلبہ میں ان کی معروضی بنیادیں بڑی حد تک کمزور ہوئی ہیں اور کسی متوقع طلبہ تحریک کو سبوتاژ یا کنٹرول کرنے کے حوالے سے ان کی ریاستی آلہ کاری کی صلاحیت کھوکھلی ہوگئی ہے۔یہ صورتحال ایک بار پھر معاشرتی سطح کے نیچے دوڑتے متضاد سماجی دھاروں کا اظہار کرتی ہے۔ایسے میں ہر طرح کی گھٹن اور کٹھنائیوں کے باوجود طلبہ یکجہتی مارچ سے لے کر عورت مارچ تک ریاست کے کلیدی مراکز میں موجود یونیورسٹیوں کے طلبا و طالبات نے بھی بہت متحرک کردار ادا کیا ہے۔جس سے نوجوانوں کی ان

نسبتاً مراعت یافتہ پرتوں کی فی الوقت دبی ہوئی اور مخفی انقلابی صلاحیتوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

(321) حالیہ سالوں میں مہنگائی، بیروزگاری، جرائم اور عمومی عدم استحکام میں اضافے کی وجہ سے ملک سے باہر جانے کے رجحان میں بھی بہت اضافہ ہوا ہے۔ اس میں تازہ یونیورسٹی گریجویٹ بھی شامل ہیں جن کی کوشش ہوتی ہے کہ یہاں ڈگری کرنے کے بعد ترقی یافتہ ممالک بالخصوص یورپ یا امریکہ میں سکالرشپ مل جائے۔ اگر پیسے والے ہوں تو سٹڈی ویزا خریدنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن نسبتاً مراعت یافتہ پیشوں سے وابستہ افراد (جن میں ڈاکٹر، نرسز، انجینئر وغیرہ سرفہرست ہیں) بھی بڑے پیمانے پر ہجرت کا راستہ اختیار کر رہے ہیں۔ ان حالات میں پھر ویزا کنسلٹنٹس کیساتھ ساتھ لینگویج ٹیسٹوں کی تیاری کروانے والے ادارے کھمبیوں کی طرح اگ آئے ہیں جو بھاری فیسیں وصول کرتے ہیں۔ لیکن اس سے بھی زیادہ فیسیں مغربی سفارت خانے اور لینگویج ٹیسٹ لینے والے بین الاقوامی ادارے بٹورتے ہیں۔ بعض صورتوں میں کئی کئی بار یہ فیسیں ادا کرنی پڑتی ہیں۔ اسی طرح ہنرمند یا نیم ہنرمند مزدوروں کی خلیجی ممالک کی طرف ہجرت جاری ہے جہاں کنسٹرکشن جیسے شعبوں میں انہیں بدترین استحصال کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔

(322) ان سب سے ہٹ کر نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے جو غیر قانونی طریقوں سے مغربی ممالک جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ زیادہ تر غریب گھرانوں کے کم تعلیم یافتہ اور غیر ہنرمند نوجوان ہوتے ہیں جن میں سے بیشتر 'ڈنکی' لگانے کی کوشش میں مارے بھی جاتے ہیں۔ جو یورپ یا امریکہ پہنچ بھی جاتے ہیں انہیں غیر قانونی تارکین وطن کے طور پر چھپ چھپا کے زندگی گزارنی پڑتی ہے اور انتہائی کم اجرتوں پر سخت حالات میں کام کرنا پڑتا ہے۔

(323) تاہم قانونی طریقوں سے مغرب جا کر 'سیٹل' ہو جانے والوں کی اکثریت کے لئے بھی وہاں سماجی طور پر ایڈجسٹ کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ ایک طرف ان کے پسماندہ رویوں اور عقائد کا جدید معاشروں کی اقدار کے ساتھ ٹکراؤ بنتا ہے۔ دوسری طرف مقامی آبادیوں کے نسل پرستانہ رویے ان کی بیگانگی میں اور بھی اضافہ کر دیتے ہیں۔ مسلمانوں کو بالخصوص ان مسائل کا

سامنا کرنا پڑتا ہے جس کی ایک وجہ حالیہ دہائیوں میں اسلامی بنیاد پرستی کا ابھار ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی خود جدید سرمایہ داری کے اپنے بحران کی وجہ سے مغربی معاشروں میں تارکین وطن کو اپنے اندر ضم یا جذب کرنے کی صلاحیت کم ہوئی ہے۔ جبکہ پسماندہ خطوں میں حالات زندگی اس قدر کٹھن ہو گئے ہیں کہ مغرب کی طرف قانونی و غیر قانونی ہجرت میں ہوشربا اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ صورتحال مغربی معاشروں میں نئے تضادات کو جنم دے رہی ہے جس کا ایک اظہار وہاں نسل پرستی کے سیاسی و سماجی رجحانات میں اضافہ ہے۔

(324) شدید بیگانگی، استرداد اور ثقافتی ٹکراؤ کی کیفیت میں یہ تارکین وطن پھر عجیب کنفیوژن اور منافقت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر، جو اپنے ملکوں میں خاصے ترقی پسند اور سیکولر خیالات کے مالک ہوتے ہیں، وہاں جا کے انتہائی مذہبی اور قدامت پسند بن جاتے ہیں اور مختلف فرقوں کے تبلیغی رجحانات سے منسلک ہو جاتے ہیں۔ بلکہ کچھ تو باقاعدہ جہادی گروہوں اور مغرب میں شریعت نافذ کرنے میں سرگرم جماعتوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ایک بڑی تعداد پیروں فقیروں، بابوں اور حکیموں کی پیروکار بن جاتی ہے۔ مثلاً پاکستان اور انڈیا میں بیشتر پیروں یا بابوں کی آمدن کا بڑا ذریعہ مغربی ممالک میں ان کے مرید ہیں۔ اسی طرح سیاسی طور پر بھی یہ لوگ انتہائی رجعتی خیالات کے حامل بن جاتے ہیں۔ جس کی ایک واضح مثال پھر تحریک انصاف کا مظہر ہے۔ بی جے پی کی بھی بڑی حمایت ہندوستانی تارکین وطن میں موجود ہے۔

(325) ان حوالوں سے دیکھیں تو بالخصوص یورپ اور امریکہ کی طرف آج کی ہجرت کا کردار کچھ دہائیاں پہلے کی نسبت بہت مختلف ہو چکا ہے۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد کے معاشی بوم اور ثقافتی ابھار کے وقتوں میں مغربی معاشرے بڑی حد تک تارکین وطن کو اپنے اندر جذب کر لینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اس وقت کے تارکین وطن بھی مغربی اقدار کو اپنانے کے حوالے سے خاصے 'اوپن' ہوا کرتے تھے کیونکہ سامراج کی سپانسرڈ مذہبیت اور بنیاد پرستی نے سوچوں اور رویوں میں ابھی اتنی گہری سرایت نہیں کی تھی۔ لیکن 9/11، پھر افغانستان اور عراق کی جنگوں اور

پھر شام اور لیبیا وغیرہ میں خانہ جنگیوں وغیرہ نے صورتحال کو بہت تیزی سے تبدیل کیا ہے اور ''تہذیبوں کے تصادم'' کی رجعتی سوچ کو ابھارا ہے۔ اس مساوات میں 2008ء کے بعد مختلف اتار چڑھاؤ کے ساتھ جاری معاشی بحران کو شامل کریں تو ہجرتوں کی شدت بڑھ گئی ہے جبکہ گنجائش اسی قدر کم ہوگئی ہے۔

(326) اس عمل سے مہاجرین کے آبائی وطن بھی معاشی و سماجی حوالے سے شدید متاثر ہوتے ہیں۔ مثلاً لیبر فورس کی انتہائی ہنر مند پرتوں کے انخلا سے لمبے عرصے میں معیشت کی پیداواریت اور معیار بری طرح گراوٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ پاکستان میں تارکین وطن کی ترسیلاتِ زر کو معیشت کے لئے بہت بڑا سہارا سمجھا جاتا ہے۔ سطحی سوچ کے تحت یہ بات بالکل درست معلوم ہوتی ہے۔ لیکن ایک متبادل صورت کو مدنظر رکھیں جس میں ان انتہائی پڑھے لکھے او رہنر مند لوگوں کی صلاحیتوں کو ملک کے اندر بروئے کار لایا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا یہاں سے چلے جانا کتنے بڑے نقصان کا باعث ہے۔ اس نقصان کے سامنے ترسیلات زر کا فائدہ انتہائی حقیر، معمولی اور وقتی ہے۔

(327) سماجی حوالے سے یہ ترسیلاتِ زر یہاں نو دولتیوں کی نئی پرتیں پیدا کر کے نمائش اور مقابلہ بازی کی نفسیات کو جنم دیتی ہیں۔ باہر محنت کرنے والوں کے حالات جو بھی ہوں لیکن ان کے بھیجے پیسے سے یہاں پسماندہ اور بدحال خطوں میں ''کوٹھیاں'' کھڑی کی جاتی ہیں جو خرچے کے حساب سے عالیشان لیکن جمالیاتی حوالے سے انتہائی بھدی ہوتی ہیں۔ گاڑیاں اور زمینیں خریدی جاتی ہیں اور دوسری ہر طرح کی تصنع اور بناوٹ کا سامان کیا جاتا ہے جس کی پھر سوشل میڈیا پر خوب تشہیر کی جاتی ہے۔ ان حالات میں پھر باقی لوگ بھی اپنے دن پھیرنے اور ''جیک'' لگانے کے لئے قانونی و غیر قانونی طریقوں سے باہر جانے کے چکر میں پڑ جاتے ہیں۔ جو نہیں جا پاتے وہ قسمت کو کوستے اور حسد میں جلتے رہتے ہیں۔

(328) سیاسی حوالے سے بات کریں تو یہ عوامل حالات کا مقابلہ کرنے اور انہیں بدلنے کی

جدوجہد کی بجائے فرار کے رجحان کو پروان چڑھاتے ہیں، محنت کشوں کو 'ڈی کلاس' کرنے کا باعث بنتے ہیں اور طبقاتی جدوجہد کو زائل کرتے ہیں۔

(329) اسی طرح یہاں پراپرٹی اور رئیل اسٹیٹ کی سٹے بازی کو جاری رکھنے میں بھی اس بیرونی پیسے نے کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ جس نے ایک طرف صنعت اور زراعت سے وسائل کھینچ کر معیشت کا بیڑہ مزید غرق کیا ہے۔ دوسری طرف ''پراپرٹی ڈیلنگ'' پر مبنی شارٹ کٹ اور دو نمبری کی سوچ کو عام کر دیا ہے۔ جس کا اندازہ یہاں سے لگایا جا سکتا ہے کہ سرکاری دفتروں میں کام سے زیادہ بات چیت پلاٹوں اور سٹاک مارکیٹ کے شیئرز کے اتار چڑھاؤ پر ہوتی ہے۔

(330) انٹرنیٹ کے فروغ اور روزگار کے فقدان نے نوجوانوں میں فری لانسنگ اور ای کامرس کے رجحان میں بھی اضافہ کیا ہے۔ لیکن ان شعبوں کے حوالے سے بہت سی خوش فہمیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ اس وقت سوشل میڈیا پر 'ای کامرس' کے کورس بیچنے والوں کی بھرمار ہے جن میں طرح طرح کے نوسر باز اور فراڈیئے بھی شامل ہیں۔ ان میں سے کچھ تو سوشل میڈیا کے ستاروں کا درجہ حاصل کر چکے ہیں۔ بڑے شہروں میں ایسے کورس کروانے والی اکیڈمیاں بھی کھل رہی ہیں۔

(331) یہ سارا سلسلہ پھر ''موٹیویشنل سپیکنگ'' سے بھی جڑا ہوا ہے جس میں غربت اور محرومی کو انسان کی ذاتی ''چوائس'' قرار دیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ کیسے فلاں آدمی سوشل میڈیا، بٹ کوائن یا ای کامرس وغیرہ کے ذریعے راتوں رات امیر ہو گیا۔ یہ آدمی بالعموم کورس بیچنے والے صاحب ہی ہوتے ہیں۔ یہ چورن بھی بہت بیچا جاتا ہے کہ نوکری میں کچھ نہیں رکھا اور ''اپنا کاروبار'' کیا جانا چاہئے چاہے ٹھیلہ لگانا پڑے۔ نہ صرف نوجوان بلکہ بہت سے پکی عمر کے افراد بھی ان باتوں کے جھانسے میں آجاتے ہیں۔ حالانکہ ایک بورژوا نقطہ نظر سے بھی معیشت کی بنیادی سمجھ بوجھ رکھنے والا انسان بتا سکتا ہے کہ یہ سب بکواس ہے۔

(332) اس تناظر میں یہ بات بالکل واضح ہونی چاہئے کہ سوشل میڈیا، ڈیجیٹل کرنسی (بٹ کوائن وغیرہ) اور ای کامرس وغیرہ کوئی پیداواری شعبے نہیں ہیں۔ بلکہ یہ پیداوار سے حاصل

ہونے والی سماجی دولت میں سے کمیشن خوری، سٹہ بازی یا تجارتی ہیر پھیر کے ذریعے حصہ بٹورنے کے اوزار ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ ''نوکری'' کرنے والے محنت کشوں کی پیدا کردہ دولت ہی ہے جس پر ''اپنا کاروبار'' کرنے والے یہ طفیلی عناصر پلتے ہیں۔

(333) علاوہ ازیں ایسی سرگرمیاں سرمایہ دارانہ معیشتوں میں انٹرنیٹ سے پہلے بھی موجود تھیں لیکن انٹرنیٹ نے انہیں زیادہ تیز رفتار اور عالمی سطح پہ زیادہ منسلک یا مربوط کر کے ایک نئی شکل دے دی ہے۔ ایسے میں ان کاروباروں سے کچھ لوگ یقیناً امیر ہو سکتے ہیں اور اگر متعلقہ شعبہ مخصوص حالات میں پھل پھول رہا ہے تو ان لوگوں کی تعداد زیادہ بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن اس چکر میں جب بے شمار لوگ اس شعبے کا رخ کریں گے تو منافع خوری کی گنجائش کم سے کم ہوتی جائے گی اور ایک نہج پہ پہنچ کے بہت سے لوگوں کو فارغ ہونا پڑے گا۔ جن میں زیادہ تر نئے کھلاڑی ہوں گے۔

(334) فری لانسنگ میں اگرچہ بہت سا کام پیداواری بھی ہوتا ہے لیکن یہاں بھی جب افرادی قوت کی بہتات ہو جائے گی تو اجرتیں گر جائیں گی اور اضافی لوگوں کو کام نہیں مل پائے گا۔ ایسے میں پرانے اور زیادہ تجربہ کار لوگ ہی چل پائیں گے۔ اس حوالے سے دیکھیں تو فری لانسنگ بھی بیشتر صورتوں میں کچی نوکری کی ہی ایک شکل ہے جس میں کمپنیاں ضرورت پڑنے پر آپ سے کام لیتی ہیں اور جب کام نہیں ہوتا تو فارغ بیٹھنا پڑتا ہے۔ اسے سرمایہ داری کی زبان میں 'گِگ ورک' کہا جاتا ہے جو پرانی شکلوں والی کچی نوکریوں سے بھی زیادہ عارضی ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں ای کامرس کی طرح فری لانسنگ بھی معیشت کی مجموعی کیفیت یا حالت کے ساتھ جڑی ہے۔ ایک عمومی معاشی بحران کی کیفیت میں ظاہر ہے ان شعبوں کا بیٹھ جانا بھی ناگزیر ہے۔

(335) گزشتہ کچھ سالوں میں بٹ کوائن کا بھی بڑا شور تھا اور اسے نہ صرف مروجہ بینکاری بلکہ پوری سرمایہ داری کا نعم البدل قرار دینے والے پڑھے لکھے احمقوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ لیکن مختصر عرصے میں یہ واضح ہو چکا ہے یہ نام نہاد ڈیجیٹل کرنسیاں' زر کی مروجہ شکلوں کا متبادل نہیں ہو سکتیں۔ یہ سراسر مالیاتی سٹے بازی کے اوزار ہیں جن سے کچھ لوگ بہت امیر ہوئے ہیں تو اس سے

کہیں بڑی تعداد اپنی جمع پونجی لٹوا چکی ہے۔

(336) یوں جدید ٹیکنالوجی سے جڑے یہ شعبے بھی سرمایہ دارانہ استحصال اور منافع خوری کا ہی تسلسل ہیں۔ خود کو زندہ رکھنے کے لئے نئی تکنیکوں اور معاشی شعبوں کا قیام سرمایہ داری کی تاریخی ضرورت ہے۔ لیکن یہ تاریخی عمل سرمائے کو چند ہاتھوں میں مرتکز کرتے چلے جانے کے رجحان پر مبنی ہوتا ہے۔ جس میں بڑی اجارہ داریاں' چھوٹی کمپنیوں اور کاروباروں کو نگلتی جاتی ہیں۔ یوں ہر انسان ''اپنا کاروبار'' کر کے خوشحال یا امیر نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ جہالت کی معراج پہ بیٹھے موٹیویشنل سپیکر اور ای کامرس کے 'گرو' تاثر دیتے ہیں۔ ترقی یافتہ ترین ممالک میں بھی چھوٹے کاروباروں کی بہت بڑی اکثریت ابتدائی چند مہینوں یا سالوں میں ہی بند ہو جاتی ہے۔ ان میں سے مٹھی بھر ہی ہوتے ہیں جو کسی قدر بڑی کمپنیوں میں تبدیل ہو پاتے ہیں۔ جن کی پھر ''سکسیس سٹوریز'' پیش کر کے نوجوانوں میں ایک طرح کا احساس جرم پیدا کیا جاتا ہے۔ جس کے تحت وہ اپنی حالت کا ذمہ دار خود کو ہی گردانے لگتے ہیں۔ یہ اس نظام کی متروکیت اور ناکامی کو چھپانے کی وارداتوں میں سے ایک واردات ہے۔

(337) انفرادی بنیادوں پر تگ و دو چند افراد کی زندگیاں تو بہتر بنا سکتی ہے لیکن سماجی اذیتوں اور مسائل کا مداوا نہیں کر سکتی۔ تاریخی طور پر بیمار معاشرے بڑے پیمانے کی جراحی کے متقاضی ہوتے ہیں جو انقلابات کے ذریعے ہی کی جا سکتی ہے۔ محنت کش طبقات جب انقلابی تحریکوں میں اٹھتے ہیں تو نہ صرف حکمران طبقات کی غلیظ سیاست کو چیر پھاڑ کے بلکہ ماضی کے ہر رجعتی تعصب اور فرسودہ عقیدے کو پیروں تلے روند کے اپنے عظیم تاریخی مقاصد کی طرف بڑھ جاتے ہیں۔ محکوموں کی نفسیات پہ پڑی یاس، ناامیدی اور بیگانگی کی دھول اور کائی چھٹ جاتی ہے۔ انسانوں کے ارادوں، رویوں اور احساسات کو جلا مل جاتی ہے اور انفرادی بقا کی کشمکش پر اشتراکی نجات کی جدوجہد حاوی ہو جاتی ہے۔

*****

(338) اس دستاویز میں ریاست، سیاست، معیشت، معاشرت اور قومی مسئلے کا پیش کیا گیا تجزیہ بڑی حد تک پاکستان کی موجودہ صورتحال اور مستقبل کے امکانات کو واضح کر دیتا ہے۔ جس میں ایک طرف پاکستانی سرمایہ داری شدید بحرانوں کا شکار ہو کے اس معاشرے کو جدید بورژوا بنیادوں پر استوار کرنے میں تاریخی طور پر ناکام ہو چکی ہے۔ لیکن دوسری طرف گزشتہ تقریباً چار دہائیوں میں مزدور تحریک اور طبقاتی جدوجہد خود ایک پسپائی کا شکار رہی ہے۔

(339) تناظر کی تخلیق میں حالات وواقعات کو بحیثیت مجموعی یا ایک کلیت میں دیکھنا لازم ہوتا ہے۔ سماجوں میں متضاد رجحانات اور دھارے سرگرم عمل ہوتے ہیں جنہیں مدنظر رکھتے ہوئے طاقتوں کے مجموعی توازن اور عمومی یا حاوی رجحانات وعوامل کا اندازہ لگانا پڑتا ہے۔ اس تجزیئے میں سماج کی عمومی ثقافتی کیفیت کے ساتھ ساتھ متحارب طبقات کی نفسیاتی حالت اور مورال کا جائزہ لینا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔

(340) ادھورے تجزیئے یا تو یاس اور ناامیدی کی طرف لے جاتے ہیں جہاں سے پھر نظام سے مصالحت اور اصلاح پسندی کا سفر شروع ہوتا ہے۔ یا پھر یہ ایسی مصنوعی رجائیت کو جنم دیتے ہیں جس کی بنیاد پر تشکیل دی جانے والی حکمت عملی سراسر ناقص اور بھونڈی ہوتی ہے اور لمبے عرصے میں واپس مایوسی کی طرف لے جاتی ہے۔

(341) ان کٹھن حالات میں بھی پاکستان کا محنت کش تحریکوں میں اترتا رہا ہے۔ لیکن ایک طویل عرصے سے یہ تحریکیں زیادہ تر پبلک سیکٹر تک ہی محدود نظر آتی ہیں جن میں محکمہ صحت، تعلیم، سول انتظامیہ، ریلوے اور واپڈا وغیرہ کے محنت کش شامل رہے ہیں۔ علاوہ ازیں تقریباً تمام صورتوں میں یہ دفاعی کردار کی حامل رہی ہیں۔ جن کا مقصد نجکاری، چھانٹیوں، الاؤنسز میں کمی یا تنخواہوں کی عدم ادائیگی جیسے ریاستی حملوں کو ناکام بنانا رہا ہے۔ حتیٰ کہ بجٹ کے دنوں میں احتجاجوں کے ذریعے تنخواہوں میں اضافے کو بھی افراطِ زر سے مقابلے میں دیکھیں تو حقیقی اجرتیں کم ہی ہوئی ہیں۔ محدود صورتوں میں ہی ملازمتوں کی مستقلی جیسی نسبتاً جارحانہ مانگیں سامنے آتی یا

پوری ہوتی دکھائی دی ہیں۔

(342) لیکن ان حالات میں دفاعی تحریکیں بھی محنت کش طبقے کی جرات، استقامت اور انقلابی صلاحیتوں کا مظہر ہی ہیں۔ جیسے کچھ عرصہ قبل سرکاری اساتذہ نے ایک انتہائی جاندار تحریک کے ذریعے نجکاری کا حملہ پسپا کیا ہے۔ اس سے پہلے یہی اساتذہ اور کلرک شدید گرمی میں طویل احتجاجوں اور دھرنوں کے ذریعے تنخواہوں میں کچھ نہ کچھ اضافہ کروانے کے قابل ہوئے۔ ماضی قریب میں ڈاکٹروں، نرسوں اور پیرامیڈیکل سٹاف کی ایم ٹی آئی کے خلاف مشترکہ جدوجہد بھی ایک اہم پیش رفت تھی۔ اس کے علاوہ پبلک سیکٹر میں چھوٹے پیمانے کے احتجاج مسلسل جاری رہتے ہیں۔

(343) گرینڈ ہیلتھ لائنس سے لے کے اساتذہ کے احتجاجوں تک ہمیں خواتین کی بھی ایک ہراول شرکت اور شمولیت نظر آئی ہے۔ جس سے اشارہ ملتا ہے کہ اس خطے کے انقلاب میں محنت کش خواتین بہت اہم کردار ادا کریں گی اور بیشتر صورتوں میں مردوں سے آگے کھڑی نظر آئیں گی۔ اس حوالے سے خواتین میں انقلابی کام کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔

(344) ان تحریکوں کا ایک مسئلہ ایک دوسرے سے کٹا ہونا بھی ہے جس میں علیحدگی اور تنہائی کی کیفیت میں انہیں کنٹرول کرنا حکمرانوں کے لئے بہت آسان ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات کسی ایک سیکٹر یا ادارے میں انتہائی جارحانہ اور پرزور انداز سے تحریک اٹھتی ہے جس میں محنت کش یکجہتی، جرات اور بے باکی کی تاریخ رقم کرتے ہیں۔ لیکن باقی ماندہ اداروں میں تمام تر مسائل اور استحصال کے باوجود بالکل خاموشی کی کیفیت میں پھر ایسی تحریکوں کے لئے لمبے عرصے تک اپنا زور قائم رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسے میں ان تحریکوں میں سے ابھرنے والی نئی اور نسبتاً سنجیدہ اور دیانتدار یونین قیادتیں بھی ایک مرحلے پہ آ کے مطالبات کی جزوی منظوری کے بعد مفاہمت کا راستہ اختیار کرنے پہ مجبور ہو جاتی ہیں۔ لیکن پھر ان حالات میں یکسر شکست اور ناکامی کا شکار ہونے والی تحریکوں کی بھی کئی مثالیں موجود ہیں۔

2016ء میں نجکاری کے خلاف پی آئی اے کے محنت کشوں کی ہڑتال بھی ایسے ہی حالات کا شکار ہوئی تھی۔

(345) لیکن مختلف اداروں میں بیک وقت اٹھنے والی تحریکیں بھی ایک دوسرے سے یکجہتی کے رسمی پیغامات اور نعروں سے آگے بڑھنے اور ایک ٹھوس انداز سے مشترکہ لائحہ عمل اختیار کرنے میں ناکام ہوتی رہی ہیں۔

(346) گزشتہ کچھ عرصے میں مختلف اداروں کی یونینوں کے اتحاد بھی سامنے آئے ہیں جن کی قیادتیں اور لائحہ عمل ایک مرکزیت پہ مبنی ہوتے ہیں۔ یہ ایک مثبت پیش رفت ہے جس کی حاصلات بھی نظر آئی ہیں۔ لیکن یہ مختلف اتحاد بھی کئی صورتوں میں مختلف یا متضاد سمتوں میں گامزن ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے اندر بھی دھڑے بندیاں اور تقسیم نظر آتی ہے جس کا بھرپور فائدہ حکمران اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جس میں وہ اتحاد میں شامل کچھ ایسی یونینوں کے مطالبات کلی یا جزوی طور پر تسلیم کر لیتے ہیں جنہیں پورا کرنا ان کے لئے نسبتاً آسان ہوتا ہے۔ جس کے نتیجے میں یہ یونینیں یا یونینوں کے دھڑے ہڑتالوں یا دھرنوں وغیرہ سے الگ ہو جاتے ہیں اور تحریک ایک کمزوری اور بددلی کا شکار ہو جاتی ہے۔ باقی ماندہ احتجاجی محنت کشوں کو کچلنا یا پسپائی پہ مجبور کرنا ریاست کے لئے آسان ہو جاتا ہے۔

(347) پاکستان میں ٹریڈ یونین میں منظم محنت کشوں کی شرح 1 فیصد یا اس سے بھی کم ہے اور یہ یونینیں بھی زیادہ تر پبلک سیکٹر میں ہی موجود ہیں۔ لیکن سرکاری اداروں میں بھی کچے ملازمین کی ایک بہت بڑی تعداد ہے جنہیں یونین سازی کا حق حاصل نہیں ہے۔ ان محنت کشوں سے انتہائی کم اجرتوں پہ روزگار کی کسی ضمانت کے بغیر کام لیا جاتا ہے۔ کئی صورتوں میں انہیں سرکاری طور پر مقرر کردہ کم از کم اجرت بھی نہیں ملتی ہے۔

(348) 1980ء کی دہائی میں شروع ہونے والی نیولبرلزم کی یلغار کے بعد سے نہ صرف پاکستان بلکہ ترقی یافتہ مغرب میں بھی مزدور تحریک ایک بحران اور زوال پذیری کا شکار ہوئی ہے۔

اس مظہر کی تاریخی وجوہات کا جائزہ پہلے لیا جا چکا ہے جن میں سٹالنزم کے انہدام، نجکاری اور ڈاؤن سائزنگ کے حملوں کے ساتھ ساتھ چین میں بڑے پیمانے پر مینوفیکچرنگ کی منتقلی بھی شامل ہے۔ اس وقت امریکہ میں بھی صرف 10 فیصد محنت کش ٹریڈ یونین میں منظم ہیں۔ 1983ء میں یہ شرح 20 فیصد جبکہ 1960ء کی دہائی میں 30 فیصد سے اوپر تھی۔

(349) تاہم حالیہ مہینوں میں مغرب میں مزدور تحریک کروٹ لیتے نظر آ رہی ہے جس میں یورپ کے بیشتر ممالک میں تنخواہوں میں اضافے کے لئے محنت کشوں کی احتجاجی تحریکوں کے ساتھ ساتھ ایک اہم پیش رفت امریکہ میں آٹو ورکرز کی کامیاب ہڑتال ہے جس میں نئی قیادت، نئے طریقے اور نیا جوش و ولولہ نظر آیا ہے۔

(350) لیکن مزدور تحریک صرف مقداری نہیں بلکہ معیاری حوالے سے بھی زوال پذیری کا شکار ہوئی ہے۔ جس میں بچی کھچی یونینوں میں بالخصوص بالائی سطح پر بدعنوانی، مفاہمت، دھڑے بندی، ایک دوسرے کی ٹانگیں کھینچنے، انتظامیہ کی چاپلوسی وغیرہ جیسے رجحانات نے بڑے پیمانے پر سرایت کی ہے۔ سرکاری اداروں کی نجکاری کے لئے جس وسیع کرپشن کو جواز بنایا جاتا ہے اس میں یونین قیادتوں کی بھی حصہ داری موجود رہی ہے۔ بیشتر صورتوں میں یہ قیادتیں ریاست کے مکمل کنٹرول میں ہیں۔ نیچے سے محنت کشوں کے دباؤ کے تحت انہیں جب ہڑتالوں یا احتجاجوں کا رخ کرنا پڑتا ہے تو وہاں بھی سرکاری افسر شاہی کے ساتھ ایک 'انڈر سٹینڈنگ' موجود ہوتی ہے اور ایسی تحریکوں کو بھی محنت کشوں کا غم و غصہ زائل کر کے 'سٹیٹس کو' کو تحفظ دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن اس کے لئے پھر محنت کشوں کو کچھ نہ کچھ دینا بھی ان کی مجبوری ہوتی ہے۔

(351) ریاست اور یونینوں کی افسر شاہی میں موجود اس بدعنوانی کو محنت کشوں کی نچلی پرتوں میں سرایت کروانے کی بھی بھرپور کوشش کی جاتی ہے۔ بالخصوص ایسے انقلابی یا باغی عناصر جنہیں دھمکانا یا کچلنا ممکن نہ ہو انہیں پھر خریدنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن اس سے ہٹ کے بھی

معاشرتی گراوٹ اور کالے دھن کے پھیلاؤ کے ساتھ بدعنوانی اور موقع پرستی کا جو عمومی ماحول اور سوچ پروان چڑھی ہے اس نے محنت کش طبقے میں بھی سرایت کی ہے۔ جس سے محنت کشوں کا شعور بھی گھائل اور زنگ آلود ہوا ہے۔ اس کے ناگزیر اثرات پھر مزدور تحریک پر بھی مرتب ہوئے ہیں۔

(352) اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ یونینوں میں دیانتدار یا ترقی پسندانہ سوچ رکھنے والے لوگ موجود نہیں ہیں۔ لیکن مذکورہ بالا حقائق ایک عمومی صورتحال کی عکاسی کرتے ہیں جو ایک انقلابی کیفیت میں مزدور تحریک کی بڑے پیمانے پر بحالی کے بغیر قائم ہی رہے گی۔ ایسے میں انقلابیوں کو انہی حالات میں کام کرنا پڑے گا جس کا مقصد نہ صرف ترقی پسندانہ یا انقلابی رجحانات رکھنے والے یونین کارکنان کو اپنے ساتھ جوڑنا ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر عام محنت کشوں تک رسائی حاصل کرنا ہے جن کی بڑی تعداد ایسے نوجوانوں پر مشتمل ہے جو اپنی قیادتوں کی مفاہمت اور بدعنوانی کی روش سے نالاں اور بددل نظر آتے ہیں۔

(353) لیکن اس کیفیت میں بھی سرکاری اداروں کی یونینیں ریاست کے لئے دردِسر کا باعث بن سکتی ہیں۔ بالخصوص جب حکمرانوں کا ارادہ نجکاری کے جارحانہ پروگرام کا نفاذ ہو۔ ان حالات میں پھر 'لازمی سروسز ایکٹ' کے کالے قانون کا سہارا لیا جاتا ہے جسے پی آئی اے اور سول ایوی ایشن میں بھی نافذ کیا گیا ہے۔ لیکن اب اس قانون کو واپڈا کے محنت کشوں پر لاگو کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے جس کا مقصد نگران حکومت کی جانب سے بجلی کی ڈسٹری بیوشن کمپنیوں کی لوٹ سیل (نجکاری) کی پلاننگ ہے (حالانکہ بورژوا نقطہ نظر سے بھی ایک نگران یا عبوری حکومت کے پاس ایسا کوئی اختیار نہیں ہونا چاہئے)۔ اس حملے کے خلاف واپڈا مزدوروں کی مزاحمتی تحریک ابھرنے کے بھی واضح امکانات موجود ہیں۔ لیکن ہر ادارے یا محکمے میں یونین سازی پر ایسی قدغنوں کے خلاف بھرپور جدوجہد کی جانی چاہئے۔

(354) اس وقت پاکستان کی لیبر فورس کا حجم تقریباً آٹھ کروڑ ہے۔ اس کا چھوٹا سا حصہ ہی (آئی ایل او کے مطابق تقریباً 7 فیصد) سرکاری اداروں کے محنت کشوں یا ملازمین پر مبنی ہے۔

یوں محنت کش طبقے کا وسیع اکثریتی حصہ پھر نجی شعبے سے وابستہ ہے۔

(355) مجموعی ورک فورس میں سے 37 فیصد لوگ زراعت، تقریباً اتنے ہی سروسز اور باقی 25 فیصد صنعت سے جڑے ہوئے ہیں۔ لیبر فورس کا 21 فیصد خواتین پر مشتمل ہے۔ 1990ء میں یہ شرح 13 فیصد تھی۔ عالمی معیارات کے حوالے سے یہ شرح خاصی کم ہے لیکن اس میں مسلسل اضافے کا رجحان موجود ہے۔

(356) اس کے علاوہ ایک کروڑ سے زائد محنت کش ملک سے باہر محنت مزدوری کر رہے ہیں۔ جن کا بڑا حصہ (نصف سے لے کے تین چوتھائی تک) خلیجی ممالک میں موجود ہیں۔ ملک سے ہجرت کا یہ سلسلہ حالیہ سالوں میں بہت تیز ہو گیا ہے۔ ان میں انتہائی ہنرمند لیبر کی بڑی تعداد کو مدنظر رکھیں تو یہ ملکی معیشت کی قیمتی انسانی وسائل سے بہت بڑی محرومی بن جاتی ہے۔

(357) پبلک سیکٹر کے مقابلے میں نجی شعبے کے محنت کشوں کے حالات انتہائی تلخ ہیں۔ یہاں لیبر قوانین کا اطلاق اور 32 ہزار روپے کی کم از کم اجرت بھی بیشتر صورتوں میں ایک خواب ہے۔ کام کے اوقات کار 12 گھنٹے یا اس سے بھی زیادہ ہو سکتے ہیں جبکہ روزگار کی کوئی ضمانت میسر نہیں ہے۔ چند بڑے نجی اداروں کے محنت کشوں کی ایک محدود تعداد سے ہٹ کے سوشل سکیورٹی اور پنشن وغیرہ کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

(358) ان میں پھر ایک بہت بڑی تعداد پسماندہ خطوں سے صنعتی مراکز کی طرف ہجرت کرنے والوں پہ مشتمل ہے۔ کیونکہ وقت کے ساتھ زراعت میں لوگوں کو کھپانے کی صلاحیت کم ہوتی جاتی ہے۔ یوں پاکستان میں اربنائزیشن کا عمل تیزی سے جاری ہے اور اگلی کچھ دہائیوں میں ملک کی اکثریتی آبادی شہروں میں آباد ہو گی۔ اس وقت بھی شہروں میں رہنے والوں کی کل آبادی میں شرح تقریباً 40 فیصد ہو چکی ہے۔ تناظر کی تخلیق کے حوالے سے یہ پیش رفت انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔

(359) پسماندہ علاقوں سے شہروں میں آنے والے ان محنت کشوں کے انتہائی کسمپرسی اور غربت پر مبنی دیہی پس منظر اور ہجرت پر مبنی سماج حیثیت کو بھی ان کے بے انتہا استحصال کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ انتہائی قلیل اجرتوں (بالعموم 15 سے 20 ہزار) میں انہیں شہروں میں خود بھی گزارا کرنا ہوتا ہے اور پیچھے خاندانوں کو بھی پیسے بھیجنے ہوتے ہیں۔ یوں انہیں انتہائی غیر انسانی حالات میں زندگی گزارنی پڑتی ہے جہاں چھوٹے چھوٹے کمروں میں درجنوں محنت کش رہتے ہیں اور بعض اوقات واش روم تک کی سہولت بھی میسر نہیں ہوتی۔ فاقہ کشی ان محنت کشوں کی زندگیوں کا معمول ہے۔

(360) پاکستانی آبادی کا نصف 20 سال سے بھی کم عمر ہے جبکہ 64 فیصد آبادی 30 سال سے نیچے ہے۔ یوں آج پرولتاریہ کی وسیع اکثریت نوجوانوں پر مشتمل ہے جنہوں نے نہ 69-1968ء اور بھٹو کو دیکھا ہے نہ وہ سوویت یونین کے انہدام کے تجربے سے گزرے ہیں۔ بینظیر بھٹو بھی ان کی یادداشت کا ایک مبہم سا حصہ ہی ہے۔ یوں ان کی نفسیات اور شعور پر ماضی کی ان دیوہیکل شکستوں اور غداریوں کا بوجھ نہیں ہے۔ لیکن سرمایہ داری کی ذلت اور بربادیاں وہ ہر روز دیکھتے اور سہتے ہیں۔

(361) کسی بڑے شہر کے ایک صنعتی علاقے کو ہی دیکھ لیں تو وہاں سینکڑوں یا ہزاروں کی تعداد میں فیکٹریاں اور کارخانے موجود ہو سکتے ہیں جہاں ایسے لاکھوں نوجوان محنت کش ایک اجتماعی صورت میں اپنے شب و روز گزارتے ہیں اور ذلت و استحصال کا سامنا کرتے ہیں۔ محنت کشوں کے ارتکاز کی اس کیفیت کے ساتھ ان کے حالات زندگی کو بھی مدنظر رکھیں تو یہ صنعتی مراکز دراصل بارود کے وہ ڈھیر ہیں جنہیں کوئی ایک چنگاری بھی پھاڑ سکتی ہے اور سارا ملکی منظر نامہ راتوں رات بدل سکتا ہے۔

(362) انقلاب کے نامیاتی عمل کے ایک معیاری نہج تک پہنچ جانے پر کمیونیکیشن کے جدید ذرائع کی موجودگی میں کسی ایک فیکٹری سے اٹھنے والا احتجاج اس تیزی سے دوسری

فیکٹریوں، دوسرے علاقوں، دوسرے شہروں اور دوسرے خطوں تک پہنچ سکتا ہے جس کی ماضی میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔ ایسی کوئی بھی تحریک پھر پبلک سیکٹر سمیت نہ صرف محنت کش طبقے کی دوسری پرتوں بلکہ وسیع تر عوام میں سرایت کرتے ہوئے ایک انقلابی صورتحال کو جنم دے سکتی ہے۔

(363) ملک میں ٹریڈ یونین کا صرف ایک فیصد محنت کشوں تک محدود ہونا جہاں مزدور تحریک کی بحرانی کیفیت کی غمازی کرتا ہے وہاں یہ بالکل متضاد نوعیت کے مضمرات کا حامل ہوسکتا ہے۔ 99 فیصد محنت کشوں کے ٹریڈ یونین میں منظم نہ ہونے کا یہ بھی مطلب ہے کہ حکمران طبقے کے پاس طبقاتی جدوجہد کے ابھار کو زائل کرنے کے لئے روایتی قیادتوں اور اصلاح پسندی کا کوئی 'بفر' یا 'شاک ابزاربر' موجود نہیں ہے۔ یوں انقلابی تحریک بہت تیزی سے قبضوں اور سرکشی کی نہج تک پہنچ سکتی ہے۔ اسی طرح ہم نے ملکی سیاست کا جو جائزہ لیا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ پیپلز پارٹی سمیت مروجہ سیاست کی کسی پارٹی میں یہ صلاحیت نظر نہیں آتی کہ ایسی کسی تحریک کو اپنے پیچھے لگا کے مفاہمت میں زائل کر سکے۔

(364) اس ملک میں تنگی، بیزاری اور بدحالی جس نہج پہ پہنچ چکی ہے وہاں کوئی ایک واقعہ بھی بڑی بغاوت کو جنم دے سکتا ہے۔ یہ قیمتوں میں ایک روپے کا مزید اضافہ بھی ہوسکتا ہے، نجکاری کا کوئی حملہ بھی ہوسکتا ہے، ریاستی جبر کی کوئی شکل بھی ہوسکتی ہے اور لوگوں کے غم وغصے کو بھڑکا دینے والا کوئی جرم بھی ہوسکتا ہے۔ غرضیکہ مقدار کے معیار میں بدلنے کی کوئی بھی صورت ہوسکتی ہے۔

(365) محنت کش طبقے کی نسبتاً منظم اور مراعت یافتہ پرتیں پہلے تحریک میں اتر کے غیر منظم پرتوں کو ابھار سکتی ہیں۔ جس میں کسی ایک ادارے کی بڑی تحریک دوسرے اداروں میں سرایت کر جائے یا بیک وقت مختلف شعبوں میں ابھرنے والی تحریکیں یکجا ہو جائیں۔ لیکن اس کے برعکس صورتحال بھی جنم لے سکتی ہے۔ حتیٰ کہ مہنگائی اور لوڈ شیڈنگ جیسے مسائل پر اداروں سے باہر ایک ''عوامی'' نوعیت کی احتجاجی تحریک ابھر سکتی ہے جس میں بیروزگاروں اور پیٹی بورژوازی کی غریب پرتیں پہلے متحرک ہونے کی طرف جائیں۔ ماضی قریب میں ایسے اشارے ملے ہیں کہ

ایسے حالات میں گھریلو خواتین بھی بڑا جرات مندانہ اور ہراول کردار ادا کرنے کی طرف جا سکتی ہیں۔اس نوعیت کے احتجاج اگر بڑے حجم اور دوانیے کے حامل ہو جاتے ہیں تو بطور طبقہ محنت کشوں کو بڑے پیمانے پر متحرک کرنے کا باعث بن سکتے ہیں۔

(366) مذکورہ بالا امکان کی ایک صورت ہم نے کچھ ہی مہینے پہلے دیکھی ہے جس میں بجلی کی مہنگائی کے خلاف پورے ملک میں چھوٹے بڑے احتجاج نظر آئے۔حکمران طبقے کے سنجیدہ دانشوروں نے سب سے پہلے اس صورتحال کی سنگینی کو محسوس کیا۔لیکن کچھ دن کے بعد ریاستی پالیسی سازوں کو بھی ادراک ہونے لگا کہ حالات تیزی سے ان کے قابو سے نکل سکتے ہیں۔جس کے بعد پھر میڈیا کو ان احتجاجوں کی کوریج کرنے سے روک دیا گیا۔تاہم اس احتجاجی سلسلے کے آگے نہ بڑھ پانے کی وجوہات زیادہ تر معروضی ہی ہیں۔

(367) اس مختصر احتجاجی دورانیے کے دوران بھی مختلف شہروں میں عوامی ایکشن کمیٹیوں کی تشکیل کی کوشش خاصی کامیاب رہی ہے۔مستقبل میں ایسے احتجاج زیادہ وسیع اور بلند پیمانے ابھر سکتے ہیں جنہیں انقلابی نعروں اور مطالبات سے لیس کر کے ملک گیر پیمانے پر یکجا کرنے کے حوالے سے یہ حکمت عملی پہلے سے کہیں بڑے پیمانے کے نتائج دے گی۔

(368) حالیہ عرصے میں ہمیں طلبہ تحریک کے احیا کے امکانات بھی نظر آئے ہیں۔جن کا جائزہ ہم پہلے لے چکے ہیں۔موجودہ حالات میں پیٹی بورژوازی کی نسبتاً مراعت یافتہ پرتوں سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں میں بھی بے چینی مسلسل بڑھ رہی ہے۔جس کے پیش نظر پاکستان میں آج بڑے پیمانے کی طلبہ تحریک بھڑک اٹھنے کے امکانات بھی موجود ہیں جس سے سارا منظر نامہ بدل سکتا ہے۔یہ عمل کئی طرح کی شکلیں اختیار کر سکتا ہے لیکن کسی بھی شکل میں طلبہ تحریک کا ابھار پھر محنت کش طبقے کو جھنجوڑنے کا باعث بھی بن سکتا ہے۔1968ء میں ایسی صورتحال فرانس سے پاکستان تک کئی ممالک میں نظر آئی تھی۔بار بار کے اعلانات اور وعدوں کے باوجود طلبہ یونین کو بحال نہ کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ حکمرانوں کو ایسے امکانات کا ادراک بھی ہے اور خوف بھی۔

لیکن پھر محنت کش طبقے کا تحرک بھی طلبہ کی سوچوں پر مسلط ہر طرح کے پیٹی بورژوا تعصّبات اور خوش فہمیوں کو تیزی سے صاف کرنے کا باعث بنے گا اور ان کی بڑی تعداد کو انقلابی سیاست میں متحرک کر دے گا۔

(369) اسی طرح محنت کش طبقے کے کلیدی حصے اگر تحریک میں اترتے ہیں تو بہت سی سماجی پسماندہ پرتوں کو ناگزیر طور پر اپنے پیچھے گھسیٹ لیں گے۔ جن میں پیٹی بورژوازی کے نسبتاً غریب یا نیم محنت کش حصے بھی شامل ہیں۔ شہروں میں مزدور تحریک کا انقلابی ابھار دیہاتوں پر بھی اپنے اثرات مرتب کرے گا۔ جس سے نہ صرف کسان تحریک، جو فی الوقت بالکل نحیف حالت میں موجود ہے، کی موجودہ ہیئت اور مطالبات یکسر بدل سکتے ہیں بلکہ کروڑوں کی تعداد میں کھیت مزدور بھی اپنے پرولتاری بہن بھائیوں کی پیروی کریں گے۔

(370) پاکستان جیسے ممالک میں کسانوں، چھوٹے دکانداروں، کاریگروں، رکشہ ڈرائیوروں اور ہر طرح کے 'سیلف ایمپلائڈ' لوگوں کی شکل میں دیہی اور شہری پیٹی بورژوازی بڑی تعداد میں موجود ہو سکتی ہے۔ جس کی بنیادی وجہ پھر ان خطوں میں سرمایہ داری کا تاخیر زدہ اور ادھورا ارتقا ہے۔ ایسے میں انقلابی پارٹی کو بوقت ضرورت اپنے پروگرام میں ان سماجی پرتوں کے حوالے سے بھی عبوری مطالبات شامل کرنے چاہئیں اور جو ظاہر ہے ٹھوس حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہی وضع کیے جا سکتے ہیں۔

(371) عام حالات میں ٹریڈ یونین ''بارگیننگ'' کا ادارہ ہوتی ہے۔ لیکن مزدور تحریک کے انقلابی جہت اختیار کر جانے کی صورت میں مروجہ ٹریڈ یونینیں تیزی سے ریڈکلائز ہوں گی اور ان میں محنت کشوں کی دلچسپی اور متحرک شمولیت کئی گنا بڑھ جائے گی۔ ایسے میں ہر وہ قیادت جو ان حالات سے مطابقت نہیں رکھے گی فوراً مسترد ہونے کی طرف جائے گی اور نئی قیادتوں یا بعض اوقات پوری پوری یونینوں کا ابھار ہوگا۔ یوں بیشتر صورتوں میں ٹریڈ یونین کا کردار یکسر بدل جائے گا اور وہ طبقاتی جدوجہد کے لڑاکا اداروں کی صورت میں ابھریں گی۔ اگرچہ تاریخ ایسی صورتوں

سے بھی واقف ہے کہ جب کچھ یونینیں نہ صرف انقلاب کے دوران بلکہ انقلاب کی فتحیابی کے بعد بھی رجعتی کردار کی حامل ہی رہیں۔

(372) لیکن ایسے حالات میں محنت کشوں کی غیر منظم پرتیں ایک جست لگا کے ٹریڈ یونین سے بھی بہت آگے کی ایسی تنظیمی شکلوں میں منظم ہوسکتی ہے جو ایک ابتدائی صورت میں قبضوں اور انقلابی سرکشی کے ادارے ہوں گے۔ ایسے حالات میں جو نئی ٹریڈ یونینیں جنم لیں گی وہ بھی روزِ اول سے بہت جارحانہ کردار کی حامل اور عام حالات کی ٹریڈ یونینوں سے بہت مختلف ہوں گی۔

(373) انہی حالات میں پھر مروجہ سیاست کا استرداد ایک فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہوگا اور نئی سیاسی تشکیلات کا سلسلہ شروع ہوگا۔ لیکن انتہائی انقلابی حالات میں بھی ضروری نہیں ہے کہ بورژوا پارٹیاں (دائیں اور نام نہاد بائیں بازو سمیت) فوراً مسترد ہو کر منظر عام سے غائب ہو جائیں۔ کیونکہ ایک انقلابی عمل کے دوران بھی رجعتی اور ردِ انقلابی طبقات نہ صرف سماج میں موجود رہتے ہیں بلکہ پولرائزیشن کے عمل میں سیاسی طور پر پہلے سے زیادہ متحرک ہو جاتے ہیں۔ محنت کشوں کی طرح ان طبقات کے لئے بھی انقلاب زندگی موت کا سوال ہوتا ہے۔ اسی طرح محنت کشوں کی کچھ پرتوں میں بھی اصلاح پسندی اور مفاہمت کی سوچ غالب رہتی ہے۔

(374) لیکن محنت کش طبقے کے بڑے حصے سمیت وسیع تر آبادی میں سیاسی متبادل کی تڑپ اور تلاش انتہائی تیز ہو جائے گی۔ ان حالات میں انقلابی پراپیگنڈا کو ایسی حیران کن مقبولیت ملے گی جس کا آج تصور بھی محال ہے۔ یوں انقلابی نظریات، ٹھوس ڈھانچے و ڈسپلن اور معقول لائحہ عمل رکھنے والی انقلابی تنظیم بہت مختصر عرصے میں خاصے بڑے ہجم اور اثر و رسوخ کی حامل ہوسکتی ہے جس سے اس کے ایک ملک گیر پارٹی کے طور پر ابھرنے کی راہ ہموار ہو جائے گی۔ لیکن یہاں پھر ضروری ہے کہ تنظیم کے پاس اتنی قوتیں کم از کم موجود ہوں کہ حالات و واقعات میں عملی مداخلت کی جا سکے۔ بصورت دیگر یہ سارا عمل تعطل یا ناکامی سے دوچار بھی ہوسکتا ہے۔ یہ قوتیں ظاہر ہے

آج کے کٹھن اور بڑی حد تک رجعتی حالات میں تعمیر کرنا ہوں گی۔

(375) بعض اوقات تحریکیں بہت مختصر دورانیے کی حامل ہوتی ہیں جن میں ایک وقتی ''آؤٹ برسٹ'' کے بعد دوبارہ خاموشی اور پسپائی چھا جاتی ہے۔لیکن دہائیوں کی ذلتیں اور محرومیاں برداشت کرنے کے بعد محنت کش طبقہ ایک تحریک میں اترے گا تو تمام تر ریاستی جبر و عیاریوں کے باوجود یہ انقلابی عمل طویل عرصے تک جاری رہ سکتا ہے۔ایسے میں خود ریاست بھی طبقاتی بنیادوں پر تقسیم اور ٹوٹ پھوٹ سے دوچار ہوگی۔لیکن انتہائی صورتوں میں حالات براہِ راست سامراجی مداخلت اور انقلابی خانہ جنگی کی نہج تک بھی جا سکتے ہیں۔ جسے ایک انقلابی پارٹی کی قیادت میں برسرِ پیکار محنت کش طبقے کی فتح ہی منطقی انجام تک پہنچا سکتی ہے۔ بصورت دیگر ایک خونی ردِ انقلاب اس سماج کو بربریت اور وحشت میں ڈبو دے گا۔اس کی ایک سخت مثال آج کا افغانستان ہے۔

(376) کمیونسٹ مینی فیسٹو سے لے کے آج تک کے پونے دو سو سال نے ثابت کیا ہے کہ سرمایہ داری کو نہ ٹھیک کیا جا سکتا ہے نہ یہ خود بخود ایک بتدریج جمہوری عمل کے ذریعے سوشلزم میں بدل سکتی ہے۔ایک انقلابی طریقے سے اکھاڑ پھینک کر ہی اس سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے۔ دنیا چاہے جتنی بھی بدل گئی ہو لیکن اس انقلاب کا اوزار آج بھی ایک بالشویک پارٹی ہی ہے۔باقی سب دھوکے، فریب اور مایوسی کی باتیں ہیں۔

(377) حالات و واقعات یہ بھی واضح کرتے جا رہے ہیں کہ اس معاشرے کے سامنے سوشلزم اور بربریت کے سوا کوئی تیسرا راستہ نہیں ہے۔لیکن آخری تجزیئے میں یہ انسان ہی ہیں جو اپنے عمل اور جدوجہد سے تاریخ کی روش کا تعین کرتے ہیں۔اس تناظر میں دیکھیں تو انسانیت کا سارا بحران پھر محنت کش طبقے کی قیادت کے بحران میں سمٹ کے سامنے آتا ہے۔تحریکیں تاخیر کا شکار ہو جائیں تو کٹھن معروض انقلابیوں کا بڑا امتحان لیتے ہیں۔لیکن ان کے صبر، استقامت اور مستقل مزاجی پہ پوری انسانیت کا مستقبل ٹکا ہے۔یہی ادراک انہیں بڑی سے بڑی ذلت، غداری

اور تضحیک کو جھٹک کے آگے بڑھ جانے کا حوصلہ اور شکتی دیتا ہے۔ مشکلات انہیں اور بھی مضبوط اور توانا کر دیتی ہیں۔ مشکل ترین حالات کے سامنے بھی وہ ہار ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ مارکسی اساتذہ سے ملنے والے یہی وہ آدرش ہیں جو آج کے تاریک عہد میں بھی انہیں نسل انسان کو سوشلسٹ نجات کی منزل سے قریب کرنے کی جدوجہد پہ آمادہ وگامزن رکھیں گے۔

*****

(ضمیمہ 1)

قومی سوال اور لینن

بلوچستان میں ماورائے عدالت ہلاکتوں، جبری گمشدگیوں اور عمومی ریاستی جبر کے خلاف بلوچ یکجہتی کمیٹی کے لانگ مارچ اور اسلام آباد میں جاری دھرنے نے ایک بار پھر اس ملک کے طول وعرض میں سلگتے قومی سوال کو منظر عام پر لا کھڑا کیا ہے۔ یہ احتجاج حالیہ سالوں میں یہاں کی محکوم قوموں میں ابھرنے والی چھوٹی بڑی احتجاجی تحریکوں کی ہی ایک کڑی ہے۔ پختونخواہ (بالخصوص قبائلی علاقہ جات) میں پی ٹی ایم کا ابھار ہو یا کشمیر میں مہنگی بجلی کے خلاف انتہائی جاندار اور وسیع تحریک، گلگت بلتستان میں گندم کی سبسڈی کے خاتمے کے خلاف جاری ایجی ٹیشن ہو یا سندھ میں جعلی پولیس مقابلوں میں قتل و غارت کے خلاف دھرنے... یہ تحریکیں اور احتجاج اس بحران زدہ سرمایہ دارانہ ریاست کے پسماندہ خطوں اور محکوم قوموں میں پائے جانے والی محرومی کے جذبات اور ان پر جاری مسلسل استبداد کی غمازی کرتے ہیں۔ ان آوازوں کو عوام دشمن حکمران سیاست اور ریاست کے جبر کے نیچے دبانے کی بھرپور کوشش کی جاتی رہی ہے لیکن اس کے باوجود انہیں محروم اور محنت کش طبقات میں بھرپور پذیرائی ملی ہے اور یہ ملک کے موجودہ سیاسی وسماجی منظر نامے کی تشکیل میں انتہائی اہمیت اختیار کر چکی ہے۔ یہ صورتحال ایک بار پھر اس حقیقت کی غمازی کرتی ہے کہ نہ صرف سات دہائیاں گزر جانے کے باوجود یہاں کا تاخیر زدہ اور بحرانوں میں گھرا سرمایہ دارانہ نظام قومی مسئلے کو حل کرنے سے یکسر قاصر ہے بلکہ وقت کے ساتھ قومی سوال کی شدت میں اضافہ ہی ہوا ہے۔ مزید برآں یہ کیفیت صرف پاکستان تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ ہندوستان سمیت جنوب ایشیا کی بیشتر ریاستوں میں قومی سوال حل طلب ہے۔ اگرچہ مختلف صورتوں میں اس کی ظاہریت، شدت، وسعت اور ترکیب مختلف ہو سکتی ہے۔ لیکن طریقہ ہائے واردات میں فرق کے باوجود نوآبادیاتی قبضے سے جنم لینے والی ان ریاستوں کا طبقاتی کردار ایک دوسرے سے زیادہ

مختلف نہیں ہے۔ان ریاستوں کے سامراجی قبضوں کی تاریخ 1947ء سے ہی شروع ہو جاتی ہے جس میں ایک طرف بلوچستان اور کشمیر پر فوج کشیاں کی گئیں تو دوسری طرف نہرو جیسے ''ترقی پسند'' حکمرانوں نے بھی حیدر آباد پر حملہ کر کے اسے ہندوستان میں ضم کرنے اور کشمیر کے باقی ماندہ حصے پر قبضہ کرنے میں دیر نہیں لگائی۔

مخصوص تاریخی عوامل کے نتیجے میں تشکیل پانے والے اداروں اور طبقات کا کردار بالعموم دہائیاں اور صدیاں گزر جانے کے بعد بھی نہیں بدلا کرتا۔ یوں وسیع تر تاریخی تناظر میں یہ جنوب ایشیائی ریاستیں اسی نوآبادیاتی ریاست کا ہی تسلسل ہیں جسے اس خطے کے عوام کو سیاسی، سماجی اور نفسیاتی طور پر مطیع اور مجروح رکھنے اور یہاں کے وسائل کی گہری اور وسیع و عریض لوٹ مار کے لئے تشکیل دیا گیا تھا۔ یہی صورتحال ہمیں افریقہ اور لاطینی امریکہ جیسے دوسرے پسماندہ خطوں میں بھی نظر آتی ہے۔ پہلے سینکڑوں سالوں کی براہِ راست نوآبادیاتی ڈاکہ زنی کے ذریعے ان براعظموں کو معاشی و ثقافتی حوالے سے بری طرح گھائل کیا گیا اور دنیا کے ایک بڑے حصے کی بربادی سے مغربی سرمایہ داری کی ترقی اور چکاچوند نے جنم لیا۔ لیکن دوسری عالمی جنگ کے بعد کی مخصوص صورتحال میں نوآبادکاروں کے چلے جانے کے باوجود یہاں جو ''آزاد'' ریاستیں تشکیل پائیں وہ ایک نئے سامراجی نظام کا ہی کل پرزہ تھیں۔ جس کا مقصد ان خطوں سے دولت اور وسائل کے مسلسل بہاؤ کو سامراجی مراکز کی طرف یقینی بنانا تھا۔ ایسے میں ان ریاستوں کے حکمران طبقات اسی طرح کاسہ لیسی اور کمیشن ایجنٹی پر مبنی 'کمپراڈور' کردار کے حامل رہے جس طرح نام نہاد آزادیوں سے پہلے تھے۔ ان میں نہ صرف حاکم بلکہ محکوم قوموں کے حکمران بھی شامل ہیں۔ قوم، مذہب، زبان، وسائل کی حصہ داری اور سیاسی اثر و رسوخ میں فرق یا تفاوت کے باوجود ان حکمران طبقات کے آپسی تعلق کو ایک ایسے سامراجی فریم ورک کے طور پر ہی دیکھنے کی ضرورت ہے جو طبقاتی و قومی جبر و استحصال کو قائم رکھتا ہے۔ مزید برآں یہ پسماندہ ریاستیں جہاں ایک طرف خود عالمی سامراج کی آلہ کار اور مطیع ہیں وہاں اپنے زیر قبضہ خطوں میں خود ایک سامراجی کردار کی حامل

ہیں۔ جن میں محکوم قوموں کے حکمران طبقات کا حاکم اقوام کے حکمران طبقات سے کم وبیش وہی رشتہ استوار ہوتا ہے جس میں حاکم اقوام کے حکمران طبقات عالمی سامراج سے جڑے ہوتے ہیں۔ یوں نیچے سے اوپر تک استحصال اور لوٹ مار میں حصہ داری کی ایک پوری درجہ بندی قائم ہو جاتی ہے۔ پاکستان جیسے ممالک میں ریاستی اداروں بالخصوص فوج کے انتہائی حاوی سیاسی و معاشی کردار کی وجہ سے عسکری اشرافیہ بھی اس درجہ بندی کا اہم حصہ بن جاتی ہے جس میں پھر محکوم قوموں سے تعلق رکھنے والے اہلکار بھی شامل ہوتے ہیں۔ لیکن محکوم قوموں کے حکمران طبقات یا بالادست پرتوں کے اس گماشتگی پر مبنی کردار کے باوجود قومی محرومی اور جبر و استحصال کی موجودگی سے کسی طور انکار ممکن نہیں ہے۔ تاہم دوسری طرف قوم پرستی کے ساتھ بھی مارکسزم کی کوئی مفاہمت اور مصالحت ممکن نہیں۔

ترقی یافتہ مغرب میں قومیں یا یکساں قومی ترکیب رکھنے والی قومی ریاستیں سرمایہ داری کے ایک مخصوص عہد کے پیداوار تھیں جن کی تشکیل میں انقلابات، جنگوں اور صنعتکاری نے اہم کردار ادا کیا۔ یہ بنیادی طور پر بورژوا جمہوری انقلابات کا عرصہ تھا۔ قومی ریاستوں کی تشکیل کے حوالے سے انقلاب روس کے قائد کامریڈ لینن نے اس عرصے کی نشاندہی 1789ء سے 1871ء کے درمیان کی ہے جس کے اختتام تک مغربی یورپ ''بورژوا ریاستوں کے ایک معین نظام میں بدل چکا تھا جو بالعموم قومی طور پر یکساں ریاستیں تھیں۔'' لیکن اپنے دوسرے تاریخی فرائض کی طرح سرمایہ داری دنیا کے ایک نسبتاً چھوٹے سے حصے میں ہی قومی مسئلے کو حل کر پائی۔ آج نہ صرف قومی جمہوری انقلابات ماضی بعید کا قصہ بن چکے ہیں بلکہ سرمایہ داری عرصہ قبل قومی حدود کو پھلانگ کر ایک سامراجی مرحلے میں داخل ہو چکی ہے جس کے نتیجے میں بقول لینن ''قومی جبر نے وسعت اور ایک نئی تاریخی بنیاد حاصل کر کے شدت اختیار کر لی ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ ہمیں سوشلزم کی انقلابی جدوجہد کو قومی سوال سے متعلق انقلابی پروگرام سے جوڑنا ہوگا'' (انقلابی پرولتاریہ اور قوموں کا حق خودارادیت، 1915ء)۔

آج دنیا کے بیشتر پسماندہ خطے قومی طور پر یکجا یا یکساں (Homogeneous) ریاستوں کی بجائے کثیر القومی ریاستوں پر مشتمل ہیں جہاں قومی سوال مختلف شدتوں کیساتھ موجود ہے۔ جس کی بنیادی وجہ پھر ان ریاستوں کی تاریخی تاخیر زدگی ہے۔ جس میں ایک طرف ان کی افسر شاہی اور حکمران طبقات کی مذکورہ بالا سامراجی نفسیات اور عزائم کارفرما ہیں۔ دوسری طرف یہ اقتصادی طور پر بھی اتنی نحیف اور کنگال ہیں کہ اپنے زیر اثر قوموں اور علاقوں کو ہموار اور یکساں ترقی دینے سے قاصر ہیں۔ نہ ہی ان کے پاس اتنی تاریخی گنجائش اور معاشی آسودگی و صلاحیت موجود ہے کہ یہ مختلف قوموں کو صحت مندانہ طریقے سے ضم کر کے ایک یکجا قوم کی تشکیل کر سکیں۔ ان حالات سے جنم لینے والا قومی سوال اپنی اساس میں ایک پیچیدہ سوال ہے جو بعض صورتوں میں انتہائی گنجلک بھی ہو سکتا ہے اور جس کے حل کا کوئی ایسا ریڈی میڈ فارمولا پہلے سے پیش نہیں کیا جا سکتا جسے ہر جگہ منطبق کیا جا سکے۔ لیکن اس مسئلے پر مارکسی اساتذہ کا ضخیم کام کچھ بیش قیمت عمومی اصول ضرور وضع کر سکتا ہے۔ جنہیں مدنظر رکھنا انقلابیوں کے لئے انتہائی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ ان خطوں میں قومی مسئلے کو معقول انداز میں مخاطب کیے بغیر کوئی انقلابی سوشلسٹ پروگرام وضع نہیں کیا جا سکتا۔ لینن اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھا اور قومی سوال پر مارکس اور اینگلز کے موقف کو آگے بڑھاتے ہوئے بالشویک پارٹی نے محکوم قوموں کے سامنے قومی نجات کا جو پروگرام پیش کیا وہ بالشویک انقلاب کی کامیابی میں کلیدی اہمیت کا حامل تھا۔ 'انقلابِ روس کی تاریخ' میں کامریڈ لیون ٹراٹسکی نے روس میں موجود قومی سوال اور اس کی طرف لینن کی پالیسی کا جو خلاصہ پیش کیا ہے وہ آج بھی پڑھنے اور سمجھنے سے تعلق رکھتا ہے: ''روس ایک قومی ریاست کے طور پر نہیں بلکہ قومیتوں پر مشتمل ریاست کے طور پر تشکیل پایا تھا۔ یہ اِس کے تاخیر زدہ کردار کی وجہ سے تھا... یوں ایک ایسی سلطنت تخلیق پائی جس کا صرف 43 فیصد حصہ حکمران قومیت پر مبنی تھا۔ باقی 57 فیصد میں مختلف سطحوں کی تہذیب اور محکومی کی قومیتیں شامل تھیں... لینن بہت پہلے ہی روس میں مرکز گریز قومی تحریکوں کے پنپنے کی ناگزیریت کو بھانپ چکا تھا۔ اِسی لئے کئی سال تک بالخصوص روزا

لکسمبرگ کے خلاف پرانے پارٹی پروگرام کے پیراگراف 9 کے لئے سختی سے لڑتا رہا جو قوموں کے حق خودارادیت یعنی ریاستوں کے طور پر اُن کی یکسر علیحدگی کے حق پر مبنی تھا۔ اِس طرح سے بالشویک پارٹی کسی طور پر بھی علیحدگی کی تبلیغ نہیں کر رہی تھی بلکہ کسی قومیت کو بڑی ریاست کی حدود میں زبردستی مقید رکھنے سمیت قومی جبر کی ہر شکل کے خلاف بے رحم جدوجہد کا فریضہ اپنے لئے متعین کر رہی تھی۔ روسی پرولتاریہ صرف اِسی طرح سے محکوم قومیتوں کا اعتماد بتدریج حاصل کر سکتا تھا... لیکن یہ معاملے کا صرف ایک رُخ تھا۔ قومی میدان میں بالشویزم کی حکمت عملی کا ایک دوسرا رخ بھی تھا جو بظاہر پہلے رخ سے متضاد تھا لیکن درحقیقت اُسے مکمل کرتا تھا۔ پارٹی اور بالعموم تمام مزدور تنظیموں کے ڈھانچے میں بالشویزم ایک غیر لچکدار مرکزیت پر زور دیتا تھا اور قوم پرستی کے ہر اُس کلنک کے خلاف بے رحم جنگ کرتا تھا جو مزدوروں کو ایک دوسرے کے خلاف کھڑا کرے یا اُنہیں غیر متحد کرے۔''

یہ چند سطور انتہائی خوبصورتی سے قومی سوال کی طرف لینن کی وضع کردہ پالیسی کی اساس بیان کرتی ہیں جس کا بنیادی نکتہ حاکم اور محکوم قوموں کی موجودگی اور یوں قومی بنیادوں پر جبر و استحصال کے وجود کو تسلیم کرنا ہے۔ لینن نے حاکم اور محکوم قوموں کی تقسیم کو سامراجیت کی اساس اور سامراج کے خلاف انقلابی جدوجہد کے نقطہ نظر سے ''انتہائی اہم'' قرار دیا تھا۔ یہ ایک المیہ ہے کہ آج کے بیشتر خود ساختہ مارکسی تجزیوں میں ان بنیادی حقائق کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اس کی ایک حالیہ مثال یوکرائن کی جنگ کا معاملہ ہے جس پر بہت سی مارکسی تنظیمیں انقلابی ڈیفیٹزم کی پالیسی زبردستی منطبق کرتی نظر آئی ہیں۔ ان میں ایسے بھی ہیں جو ہر بات پر لینن اور ٹراٹسکی کے اقوال پیش کرتے نہیں تھکتے لیکن یہاں مغربی سامراج کی مخالفت کی آڑ میں پیوٹن کے غیر سرکاری ترجمان بنے ہوئے ہیں۔ حالانکہ لینن نے سامراجیت کو کسی ایک سامراجی طاقت یا سامراجی کیمپ کے طور پر نہیں بلکہ مختلف چھوٹی بڑی سامراجی طاقتوں یا کیمپوں کے درمیان کشمکش کے طور پر بیان کیا تھا۔ اسی طرح جنگوں اور انقلابات کے تجزیئے میں لینن قوموں کے درمیان محکومی اور استحصال

پر مبنی تعلقات کو ہمیشہ ملحوظ رکھتا تھا اور اسی بنیاد پر اس نے نہ صرف محکوم قوموں کے حق خود ارادیت، جسے وہ بنیادی طور پر جمہوری حق قرار دیتا ہے، کو پارٹی پروگرام میں شامل کرنے کی پرزور وکالت جاری رکھی بلکہ بارہا واضح کیا کہ حق علیحدگی کے بغیر حق خود ارادیت ایک بے معنی لفاظی اور منافقت بن جاتی ہے۔ علاوہ ازیں اس نے قومی جبر کی ہر شکل (ثقافتی، لسانی، سیاسی وغیرہ) کی مخالفت کو پرولتاریہ اور اس کی پارٹی کے لئے لازم قرار دیا۔ مثلاً وہ کسی ایک زبان، جو بالعموم حاکم قومیت سے وابستہ ہوتی ہے، کو سرکاری حیثیت دے کر دوسری قومیتوں پر مسلط کرنے اور اس طرح کی دوسری قومی مراعات کا سخت مخالف تھا۔ لینن کے نزدیک قوموں کا حق خود ارادیت سوشلسٹ انقلاب کے بنیادی فرائض میں شامل تھا جس سے انکار کو اس نے سوشلزم سے غداری تک قرار دیا۔

لیکن سوشلسٹ انقلاب کا مقصد قومی مسئلے کا حل نہیں بلکہ ہر طرح کے جبر اور استحصال کی بنیادوں کو ہی نیست و نابود کر دینا ہے۔ لہٰذا مارکس اور اینگلز کی طرح لینن کسی بھی قومی مسئلے سمیت ہر جمہوری سوال کو تاریخی تناظر میں ہی دیکھتا تھا اور اس کی طرف محنت کش طبقے کے تاریخی مفادات کے تحت ہی کوئی موقف اپناتا تھا۔ کیونکہ ایک ایسا سماج جس میں تمام دولت کی پیداوار طبقاتی استحصال پر مبنی ہو وہاں طبقاتی تضاد بنیادی ترین اہمیت کا حامل ہو جاتا ہے۔ ایسے میں لینن نے بار بار واضح کیا کہ انقلابی سوشلسٹوں کے لئے قومی سوال کوئی مجرد معاملہ نہیں ہے بلکہ اسے ٹھوس سیاق و سباق کیساتھ ہی سمجھا جا سکتا ہے: ''یہ مارکسی تھیوری کی قطعی شرط ہے کہ کسی بھی سماجی معاملے پر تحقیق کرتے ہوئے اس کا جائزہ مخصوص تاریخی حدود میں لیا جائے... مارکسسٹوں کے لئے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ عمومی تاریخی اور ٹھوس ریاستی حالات کو مدنظر رکھے بغیر اپنا قومی پروگرام تشکیل دیں'' (قوموں کا حق خود ارادیت، 1914ء)۔ اسی طریقہ کار کے تحت اس نے بغیر کسی ہچکچاہٹ یا منافقت کے یہ بھی ہمیشہ واضح کیا کہ سامراجی سرمایہ داری کے عہد میں ہمارے لئے قومی سوال، محنت کش طبقے کے تاریخی نصب العین کے تابع ہے۔ مثلاً پولش سوشلسٹ پارٹی کے ساتھ ایک بحث میں لینن نے اس نکتے کو یوں بیان کیا، ''ہم معاملے کی اساس کی طرف آتے ہیں: کیا سوشل

ڈیموکریسی (یعنی مارکسسٹوں) کے لئے لازم ہے کہ وہ ہمیشہ اور غیر مشروط طور پر قومی آزادی کا مطالبہ کریں؟ یا مخصوص حالات میں ہی ایسا کیا جانا چاہئے؟ پولش سوشلسٹ پارٹی کا ہمیشہ سے یہ جواب رہا ہے کہ (قومی آزادی کے مطالبے کو) غیر مشروط طور پر تسلیم کیا جانا چاہئے... بدقسمتی سے یہ بورژوا جمہوری نعروں سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے... ان نعروں کے فریب میں گرفتار ہو کے پولش سوشلسٹ پارٹی نے ثابت کیا ہے کہ اس کا پرولتاریہ کی طبقاتی جدوجہد سے تعلق کس قدر کمزور نظریاتی پس منظر اور سیاسی سرگرمیوں کا حامل ہے۔ لیکن اسی (طبقاتی) جدوجہد کے مفادات کا تقاضا ہے کہ ہمیں قومی آزادی کے مطالبے کو اس کے تابع کرنا ہوگا۔ قومی سوال کی طرف ہمارے رویے اور بورژوا جمہوری رویے میں یہی تو فرق ہے۔ ایک بورژوا جمہوریت پسند کا خیال ہوتا ہے کہ جمہوریت' طبقاتی جدوجہد کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ اسی لئے وہ اپنے تمام سیاسی مطالبات ایک مجرد اور ''غیر مشروط'' انداز میں ''سارے لوگوں'' کے مفادات کے نقطہ نظر سے پیش کرتا ہے۔ لیکن ایک سوشل ڈیموکریٹ ہمیشہ اور ہر جگہ اس بورژوا خوش فہمی کو بے رحمی سے بے نقاب کرتا ہے...''
(ہمارے پروگرام میں قومی سوال، 1903ء)۔ اسی تحریر میں آگے جا کے لینن مثالوں کی مدد سے واضح کرتا ہے کہ مارکس اور اینگلز بھی قومی سوال کو اسی طرح لیتے تھے۔ انہوں نے جہاں پولینڈ کے حق خودارادیت کی حمایت کی وہاں جنوبی فرانس پر شمالی فرانس کے جبر کے معاملے میں موقف اپنایا کہ قومی جبر ہمیشہ آزادی کی ایسی امنگوں کو جنم نہیں دیتا جو جمہوریت اور پرولتاریہ کے مفادات سے میل کھائیں۔ اس طرح بے شمار دوسری مثالیں بھی موجود ہیں جن میں مارکس اور اینگلز نے قومی جنگوں اور جدوجہدوں کا تجزیہ پرولتاری بین الاقوامیت کے نقطہ نظر سے ہی کیا اور اسی طور سے لائحہ عمل اور مطالبات پیش کیے۔ یوں بورژوا جمہوری مطالبات کی حمایت میں بھی پرولتاریہ کی آزادانہ سیاسی اور تنظیمی حیثیت کو برقرار رکھنا لازم ہو جاتا ہے۔ اس ضمن میں لینن وضاحت کرتا ہے، ''کوئی ایک بھی جمہوری مطالبہ ایسا نہیں ہے جسے مخصوص حالات میں بورژوازی' محنت کشوں کو دھوکہ دینے کے لئے استعمال نہ کر سکے یا اس نے استعمال نہ کیا ہو... عملی طور پر پرولتاریہ اپنی

آزادی کو تب ہی برقرار رکھ پائے گا جب وہ جمہوریہ کے مطالبے سمیت تمام جمہوری مطالبات کی جدوجہد کو بورژوازی کے دھڑن تختے کی انقلابی جدوجہد کے تابع کرے'' (سوشلسٹ انقلاب اور قوموں کا حق خودارادیت، 1916ء)۔

اس بنیادی مارکسی لائحہ عمل کی وضاحت لینن نے اپنی کئی دوسری تحریروں میں بھی کی۔ مثلاً روزا لکسمبرگ کے ساتھ مناظرے میں قومی سوال کی طرف میکانکی طرز عمل کو یوں تنقید کا نشانہ بنایا، ''ہر قوم کے معاملے میں علیحدگی کے سوال کا ''ہاں'' یا ''ناں'' میں جواب شاید بہت ''عملی'' لگتا ہے۔ حالانکہ حقیقت میں یہ بالکل فضول بات ہے۔ نظریاتی طور پر یہ مابعد الطبیعاتی ہے۔ جبکہ عملی طور پر پرولتاریہ کو بورژوازی کی پالیسی کے تابع کر دیتا ہے۔ بورژوازی ہمیشہ اپنے قومی مطالبات کو سامنے رکھتی ہے... جبکہ پرولتاریہ کے لئے یہ مطالبات' طبقاتی جدوجہد کے مفادات کے تابع ہیں... پرولتاریہ کے لئے سب سے اہم اپنے طبقے کی ترقی ہے۔ جبکہ بورژوازی کے لئے اہم یہ ہے کہ وہ ''اپنی'' قوم کے مقاصد کو پرولتاریہ کے مقاصد پر حاوی کرتے ہوئے اس ترقی کے راستے میں روڑے اٹکائے... ہر قوم کی قوم پرست بورژوازی کے نقطہ نظر سے قومی مسئلے میں پرولتاریہ کا فریضہ ''غیر عملی'' ہے... لیکن پرولتاریہ ایسی عملیت پسندی کا مخالف ہے... اس کے لئے سب سے اہم تمام قوموں کے محنت کشوں کا اتحاد ہے اور وہ ہر قومی مطالبے اور ہر قومی علیحدگی کا تجزیہ محنت کش طبقے کی جدوجہد کی نقطہ نظر سے ہی کرتا ہے'' (قوموں کا حق خودارادیت، 1914ء)۔ اسی تناظر میں لینن نے تمام قوموں کے محنت کشوں کے اتحاد کو اولین ترجیح دیتے ہوئے یہ بنیادی کلیہ بھی وضع کیا کہ انقلابیوں کو قومی جبر کے خلاف ہر مطالبے کی بڑھ چڑھ کر حمایت کرنی چاہئے۔ چاہے وہ محکوم قوم کے بورژوا حلقوں کی جانب سے ہی پیش کیا جا رہا ہو۔ لیکن ساتھ ہی بورژوا قوم پرستی کی ہمیشہ مذمت اور مخالفت کی جانی چاہئے۔ مزید برآں اس نے حق علیحدگی کی حمایت نہ کرنے کو حاکم قوم کی بورژوازی اور دوسرے رجعتی طبقات کے ہاتھوں میں کھیلنے کے مترادف قرار دیا۔

یوں تمام قوموں کے محنت کشوں کی یکجہتی مارکسی اساتذہ کا اولین مطمع نظر رہی ہے اور قوم

پرستی سمیت محنت کشوں کے اتحاد میں دراڑیں ڈالنے والے ہر رجحان کو مسترد کرنا انقلابیوں کا فریضہ بن جاتا ہے۔ روزا لکسمبرگ کے ساتھ بحثوں میں لینن نے یہ بھی واضح کیا کہ قوموں کی برابری اور محکوم قوموں کے حق خودارادیت کی حمایت کسی طور بھی ''قوم پرستی'' نہیں ہے لیکن قوم پرستی کی مخالفت میں حق خودارادیت سے انکاری ہو جانا بھی کوئی معقول طرزِ عمل نہیں۔ مثلاً قوم پرستی کیساتھ انقلابی مارکسزم کے تعلق کو بیان کرتے ہوئے لینن کہتا ہے، ''کسی بھی محکوم قوم کی بورژوا قوم پرستی میں جبر کے خلاف ایک عمومی جمہوری مواد موجود ہوتا ہے اور یہی وہ مواد ہے جس کی ہم غیر مشروط حمایت کرتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ہم اس کے اور قومی اختصاصیت (باقی قوموں سے کٹ جانے) کے رجحان کے درمیان سخت تمیز برتتے ہیں'' (قوموں کا حق خودارادیت، 1914ء)۔ اسی نکتے کو وہ ایک اور جگہ کچھ یوں بیان کرتا ہے، ''جاگیردارانہ غنودگی سے عوام کی بیداری اور ہر قومی جبر کے خلاف عام لوگوں اور قوم کی خودمختاری کے لئے ان کی جدوجہد ایک ترقی پسندانہ عمل ہے۔ اس لئے یہ ہر مارکسسٹ کا لازمی فریضہ ہے کہ قومی سوال کے تمام پہلوؤں کی طرف انتہائی پختگی اور تسلسل پر مبنی جمہوریت پسندی کا مظاہرہ کرے... لیکن قوم پرستی کی حمایت میں پرولتاریہ اس سے ایک قدم آگے نہیں جا سکتا۔ کیونکہ اس سے آگے بورژوازی کی جانب سے قوم پرستی کو مضبوط کرنے کی کوششیں شروع ہو جاتی ہے'' (قومی سوال پر تنقیدی تبصرہ، 1913ء)۔

یہاں ''قومی ثقافت'' کا معاملہ بھی وضاحت کا متقاضی ہے جسے کوئی سنجیدہ سیاسی و معاشی پروگرام پیش کرنے سے عاری قوم پرستانہ رجحانات کی طرف سے انتہائی رجعتی انداز میں اچھالا جاتا ہے۔ جس میں ''ثقافت''، جسے لباس اور موسیقی تک محدود کر دیا جاتا ہے، کی انتہائی سطحی اور ظاہریت پر مبنی نمائش کو اپنی قومی برتری ثابت کرنے کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔ طبقاتی جدوجہد کی وقتی پسپائی کی کیفیت میں یہ مظہر شناخت کے بحران کی غمازی بھی کرتا ہے جس میں لوگ کبھی مذہبی فرقوں، کبھی ذات پات اور کبھی لسانی شناخت میں پناہ تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ ثقافت کو اس کے حقیقی اور وسیع تر معنوں میں انسانی رویوں اور رشتوں کیساتھ لیا جائے تو تمام

قوموں سمیت اس خطے کے معاشرے اس قدر گراوٹ اور بحران کا شکار ہیں کہ یہاں زندگی عذاب مسلسل بن چکی ہے۔اس سلسلے میں لینن نے ثقافت کا تجزیہ بھی طبقاتی بنیادوں پر ہی کیا اور کسی بھی قومی ثقافت میں ترقی پسندانہ اور رجعتی رجحانات کے درمیان فرق کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔لیکن اس کا خیال تھا کہ مجموعی طور پر کسی بھی قوم کی ثقافت پر حکمران طبقات کے تعصّبات اور مفادات کی چھاپ موجود ہوتی ہے۔ بالکل جیسے عام حالات میں سماج پر حکمران طبقات کے نظریات ہی حاوی ہوتے ہیں۔

''تمام تر لبرل بورژوا ثقافت محنت کشوں میں بدترین بدعنوانی کے بیج بوتی ہے اور آزادی و پرولتاری طبقاتی جدوجہد کے مقصد کو گہرا نقصان پہنچاتی ہے۔اس بورژوا رجحان کو جب 'قومی ثقافت' کے نعرے میں چھپایا جاتا ہے تو یہ اور بھی خطرناک بن جاتی ہے۔اس قومی ثقافت کے لبادے میں ہی... تمام قوموں کی بورژوازی نے اپنی غلیظ اور رجعتی واردات جاری رکھی ہوئی ہے... قومی ثقافت کا نعرہ ایک بورژوا فراڈ ہے۔ہمارا نعرہ ہے: جمہوریت اور عالمی محنت کش طبقے کی جدوجہد پر مبنی بین الاقوامی ثقافت'' (ایضاً)۔ثقافت کا مزید گہرائی میں تجزیہ کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے،''جمہوری اور سوشلسٹ ثقافت کے عناصر اگرچہ ابتدائی شکل میں ہی سہی لیکن ہر قومی ثقافت میں موجود ہوتے ہیں۔کیونکہ ہر قوم میں محنت کش اور استحصال زدہ طبقات موجود ہوتے ہیں جن کے حالات زندگی ناگزیر طور پر جمہوریت اور سوشلزم کے نظریات کو پروان چڑھاتے ہیں۔لیکن ہر قوم ایک بورژوا ثقافت کی بھی حامل ہوتی ہے۔جو صرف (ابتدائی نوعیت کے) 'عناصر' کی شکل میں نہیں بلکہ حاوی ثقافت کی شکل میں موجود ہوتی ہے۔اس لئے عمومی 'قومی ثقافت' جاگیرداروں، پادریوں اور سرمایہ داروں کی ثقافت ہوتی ہے... جب ہم 'جمہوریت اور عالمی محنت کش طبقے کی جدوجہد کی بین الاقوامی ثقافت' کا نعرہ لگاتے ہیں تو ہم ہر قومی ثقافت میں سے اس کے جمہوری اور سوشلسٹ عناصر ہی لیتے ہیں۔اور ان عناصر کو ہم یکسر طور سے ہر قوم کی بورژوا ثقافت اور بورژوا قوم پرستی کے برخلاف لیتے ہیں... جو کوئی بھی محنت کش طبقے کی خدمت

کرنا چاہتا ہے اسے تمام قوموں کے محنت کشوں کو ایک کرنا ہوگا اور بورژوا قوم پرستی کے خلاف غیر متزلزل لڑائی لڑانا ہوگی۔ چاہے یہ قوم پرستی مقامی ہو یا غیر ملکی'' (ایضاً)۔ آخر میں لینن ان متضاد رجحانات کے درمیان انتہائی بے رحمی سے یوں لکیر کھینچتا ہے، ''بورژوا قوم پرستی اور پرولتاری بین الاقوامیت دو ناقابل مصالحت نعرے ہیں جو پوری سرمایہ دارانہ دنیا میں دو دیوہیکل طبقاتی کیمپوں سے وابستہ ہیں اور قومی سوال کی طرف دو پالیسیوں بلکہ دنیا کو دیکھنے کے دو طریقوں کی غمازی کرتے ہیں'' (ایضاً)۔ اسی تحریر میں وہ ایک بار پھر برملا اعلان کرتا ہے کہ قوم پرستی جتنی بھی مہذب ہو جائے اس کی مارکسزم سے مصالحت نہیں ہو سکتی ہے۔ اسی طرح وہ پرولتاری بین الاقوامیت اور مزدور یکجہتی کی مادی بنیادیں بیان کرتے ہوئے کہتا ہے، ''قوم پرستی کی ہر شکل کی جگہ مارکسزم بین الاقوامیت کو فروغ دیتا ہے۔ یعنی ایک بلند تر اتحاد میں تمام قوموں کا گھل مل جانا۔ ایک ایسا اتحاد جو ہماری آنکھوں کے سامنے تعمیر ہوتی ریلوے لائن کے ہر میل کیساتھ، ہر بین الاقوامی ٹرسٹ کیساتھ اور ہر مزدور انجمن کی تشکیل کیساتھ پروان چڑھ رہا ہے۔'' علاوہ ازیں بورژوا قوم پرستی کی منافقت اور قومی سوال پر طبقاتی تضاد کے غلبے کو یوں بیان کرتا ہے، ''جوائنٹ سٹاک کمپنیوں کے بورڈز میں ہمیں مختلف قوموں کے سرمایہ دار مکمل اتحاد و اتفاق سے بیٹھے نظر آتے ہیں۔ فیکٹریوں میں مختلف قوموں کے مزدور شانہ بشانہ کام کرتے ہیں۔ ہر اہم اور گہرے سیاسی معاملے میں طرفداری کا تعین قوم نہیں بلکہ طبقہ کرتا ہے'' (ایضاً)۔ اسی نکتے کو ایک اور جگہ پہ یوں اجاگر کرتا ہے، ''سرمایہ دار اور جاگیردار ہر قیمت پر مختلف قوموں کے محنت کشوں کو تقسیم رکھنا چاہتے ہیں جبکہ خود منافع بخش کاروباروں میں حصہ داروں کے طور پر ہنسی خوشی ایک ساتھ رہتے ہیں... لیکن طبقاتی طور پر باشعور محنت کش، مزدوروں کی ہر تعلیمی، سیاسی اور ٹریڈ یونین تنظیم میں تمام قوموں کے محنت کشوں کا مکمل اتحاد چاہتے ہیں'' (محنت کش طبقہ اور قومی سوال، 1913ء)۔ اور ایک بار پھر: ''سوشل ڈیموکریسی کو تمام قومیتوں کے پرولتاریہ اور دوسرے محنت کش طبقات کو پرزور تنبیہ کرنا ہوگی کہ ان کی اپنی، بورژوازی کے قوم پرستانہ نعرے کھلے فریب پر مبنی ہیں۔ جو 'ہماری آبائی سرزمین' بارے

اپنی میٹھی یا جذباتی تقریروں کے ذریعے پرولتاریہ کو تقسیم کرنے اور اپنی بورژوا واراداتوں سے اس کی توجہ ہٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جبکہ خود دوسری قوموں کی بورژوازی اور زارشاہی کے ساتھ معاشی اور سیاسی اتحاد بناتے جاتے ہیں'' (قومی سوال پر تھیسس، 1913ء)۔

ٹراٹسکی نے بھی جب انقلاب روس کے تناظر میں محکوم قوموں کی قوم پرستی کو ''نابالغ بالشویزم کا بیرونی خول'' قرار دیا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ قومی تحریکوں میں سے ایسے انقلابی رجحانات برآمد ہو سکتے ہیں جو تیزی سے مارکسزم کے پروگرام کو اپنانے کی طرف جائیں۔ تاہم اس کے یہ معنی کسی صورت نہیں ہیں کہ قوم پرستی بحیثیت مجموعی خود کوئی ترقی پسندانہ یا انقلابی نظریہ ہے۔ جیسا کہ وہ ٹھوس مثالوں کی مدد سے واضح بھی کرتا ہے، ''قومی تحریکوں کی جانب سے انقلاب کے بنیادی عمل، یعنی پرولتاریہ کی اقتدار کے لئے جدوجہد، کی اطاعت یکدم نہیں بلکہ مختلف مراحل میں اور مختلف علاقوں میں مختلف طریقوں سے مکمل ہوئی۔ یوکرائنی، سفید روسی اور تاتاری مزدور، کسان اور سپاہی جو کیرنسکی، جنگ اور رسیفیکیشن (یعنی روسی سامراجیت اور ثقافتی بالادستی) کے مخالف تھے، اپنی مصالحت پسندانہ قیادت کے باوجود پرولتاری سرکشی کے اتحادی بن گئے۔ بالشویکوں کی معروضی حمایت سے آگے کے مرحلے میں وہ مجبور ہو گئے کہ فیصلہ کن طور پر بالشویک راستے پر گامزن ہو جائیں۔ فن لینڈ، لیٹویا، ایسٹونیا اور نسبتاً کمزور انداز میں یوکرائن میں قومی تحریک کی طبقہ بندی اتنی واضح شکل اختیار کر چکی تھی کہ صرف بیرونی دستوں کی مداخلت ہی پرولتاری انقلاب کی فتح کو روک سکتی تھی۔ ایشیائی مشرق، جہاں قومی بیداری زیادہ قدیم شکلوں میں وقوع پذیر ہو رہی تھی، بتدریج اور خاصی تاخیر سے ہی، بلکہ پرولتاریہ کے اقتدار پر قبضے کے بعد ہی پرولتاری قیادت کے ماتحت آ سکتا تھا۔ اگر آپ اِس پیچیدہ اور متضاد عمل کو بحیثیت مجموعی لیں تو نتیجہ واضح ہے: زرعی دھارے کی طرح قومی دھارا بھی اکتوبر انقلاب کے دریا میں شامل ہو رہا تھا'' (انقلابِ روس کی تاریخ)۔

پاکستان جیسے معاشروں کے حوالے سے یہ مظہر بھی قابل ذکر ہے کہ لینن نے قومی ثقافتوں

کے جن ترقی پسندانہ پہلوؤں کی بات کی ہے یہاں کی ادھوری اور تاخیر زدہ سرمایہ داری اپنے شدید بحران کی کیفیت میں انہیں کچل کے رکھ دیتی ہے۔ جبکہ انہی ثقافتوں کے رجعتی اور پسماندہ عناصر کو زیادہ زہریلا کر کے حاوی کرتی چلی جاتی ہے۔ بالکل جیسے تاریخی طور پر سیکولرازم کا علمبردار یہ نظام آج ہر طرح کی مذہبی فرقہ واریت اور بنیاد پرستی کو انسانیت پر مسلط کرنے کے درپے ہے۔

یوں مارکسی بین الاقوامیت اور سوشلسٹ انقلاب کا مقصد لینن کے نزدیک نہ صرف قومی سرحدوں کو مٹانا اور قوموں کو ایک دوسرے کے قریب لانا تھا بلکہ انہیں ایک دوسرے میں ضم کر دینا تھا۔ یہ کوئی یوٹوپیائی خواب نہیں بلکہ سرمایہ دارانہ گلوبلائزیشن نے خود وہ بنیادیں فراہم کی ہیں جن کی بنیاد پر ایسا ممکن ہے۔ لیکن سرمایہ داری کی بین الاقوامیت نہ صرف ادھوری اور تضادات سے لبریز ہے بلکہ جبر اور استحصال پر مبنی بھی ہے۔ سرمایہ داری میں اگر ایک طرف گلوبلائزیشن کا رجحان موجود ہے تو دوسری طرف انسانوں کو تقسیم اور باہم دست و گریبان رکھنا بھی اس نظام کی مجبوری بن جاتی ہے۔ بالخصوص بحران کے ادوار میں یہ نظام بدترین قوم پرستانہ اور فسطائی رجحانات کو سامنے لے آتا ہے جس کی ایک صورت ہم ''فارر ائٹ'' کی مختلف پارٹیوں اور رہنماؤں کے ابھار کی صورت میں آج دیکھ بھی رہے ہیں۔ یہ کوئی حادثہ نہیں ہے کہ 2008ء کے بعد تجارت اور سرمایہ کاری کے معاملے میں سرمایہ دارانہ گلوبلائزیشن کا رجحان پسپائی کا شکار ہوا ہے اور انسانوں کی بین الاقوامی نقل و حمل، جو ویسے ہی سرمائے کے مقابلے میں بہت محدود ہوتی ہے، زیادہ مشکل ہو گئی ہے۔ ایسے میں پرولتاری بین الاقوامیت ہی وہ نظریہ اور لائحہ عمل بن سکتا ہے جو ماضی کے ہر طرح کے رجعتی اور زہریلے تعصّبات کا قلع قمع کرے۔

لینن کے نزدیک قوموں کے حق خودارادیت کو تسلیم کیے جانا عالمی سوشلسٹ انقلاب کی جدوجہد کا ایک پہلو تھا تاکہ مستقبل میں قوموں کی رضاکارانہ سوشلسٹ فیڈریشن کی راہیں ہموار ہو سکیں (جیسے کہ مارکس کا خیال تھا کہ برطانوی محنت کش طبقے کو آئرلینڈ کی برطانیہ سے علیحدگی کی حمایت کرنی چاہئے تاکہ دونوں قوموں کی ایک جمہوری اور رضاکارانہ فیڈریشن تشکیل پا سکے)۔

لیکن لینن کی انقلابی پالیسی کا اس سے بھی اہم پہلو تمام قوموں کے محنت کشوں کی طبقاتی و تنظیمی یکجہتی تھی جس کے تابع اس نے خودارادیت و علیحدگی کے حق کو کیا۔ کیونکہ تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے جب حکمران طبقات اپنے اقتدار کو بچانے یا طبقاتی مفادات کو آگے بڑھانے کے لئے ایسے حالات میں علیحدگی کا نعرہ بلند کر سکتے ہیں جب یہ وسیع تر محنت کش طبقے اور خود محکوم قوم کی اکثریتی پرتوں کے مفادات سے متضاد ہو۔ اس صورت میں محنت کش طبقے کو یہ اختیار حاصل ہونا چاہئے کہ وہ اپنے طبقاتی مفادات اور تاریخی نصب العین کی مناسبت سے علیحدگی کے خلاف ایجی ٹیشن کر سکے۔ مثلاً بالشویک انقلاب کے وقت بہت سی محکوم قوموں کے حکمران طبقات، جو تاریخی طور پر زار شاہی کے کاسہ لیس اور قومی جبر میں اس کے آلہ کار رہے تھے، اس وقت قومی آزادی اور علیحدگی کے علمبردار بن گئے جب انقلاب ان کے علاقوں میں سرایت کرنے لگا۔ لیکن مختلف قوموں کے محنت کشوں کی یکجہتی کے حوالے سے بھی لینن اپنی تحریروں میں مسلسل زور دیتا رہا کہ یہ تبھی ممکن ہے جب حاکم قوم کا پرولتاریہ ہر قسم کے قومی جبر اور مراعات کی مخالفت کرے، قومی برابری کو اپنے ایجنڈے کا حصہ بنائے اور محکوم قوموں کے حق خودارادیت کو تسلیم کرے۔ انہی بنیادوں پر وہ محکوم قوم کے محنت کشوں کا اعتماد جیت کر طبقاتی جڑت قائم کر سکتا ہے اور اس کے بغیر ''بین الاقوامیت ایک بے معنی اصطلاح ہی رہے گی۔'' جبکہ دوسری طرف محکوم قوم کے محنت کشوں کا یہ فریضہ بنتا ہے کہ وہ اپنے طبقے کو قومی بنیادوں پر تقسیم کرنے والی بورژوا قوم پرستی کو کوئی رعایت نہ دیں اور حاکم قوم کے محنت کشوں کیساتھ طبقاتی جڑت کو ہر ممکن حد تک فروغ دیں تا کہ ایک آزادانہ پرولتاری جدوجہد کی راہ ہموار ہو سکے۔ اسی طبقاتی جڑت اور جدوجہد کی بنیاد پر جب محنت کش طبقہ ایک انقلابی تحریک میں ابھرتے ہوئے خود کو قوموں کی قیادت میں لائے گا تو قومی جبر و استحصال کی بنیادوں کو ہی مٹا کے قومی سوال کو کسی تلخی اور علیحدگی کے بغیر حل کر سکے گا۔

یہاں ایک بار پھر یہ حقیقت بیان کرنا ضروری ہے کہ لینن مزدور تنظیموں یا پارٹیوں کی قومی بنیادوں پر تقسیم یا علیحدگی کا سخت مخالف تھا۔ یہی اصول اس نے انقلابی پارٹی کے لئے بھی وضع کیا:

''پارٹی کو ایک وفاقی ڈھانچہ نہیں ہونا چاہئے اور نہ ہی قومی بنیادوں پر سوشل ڈیموکریٹک گروہ تشکیل دینے چاہئیں۔ بلکہ کسی بھی علاقے میں تمام قوموں کے محنت کشوں کو یکجا کرنا چاہئے، مقامی پرولتاریہ کی تمام زبانوں میں پراپیگنڈا اور ایجی ٹیشن کرنی چاہئے، ہر قسم کی قومی مراعت کے خلاف تمام قوموں کے محنت کشوں کی مشترکہ جدوجہد کو فروغ دینا چاہئے اور مقامی و ریجنل تنظیموں کی خودمختیاری کو تسلیم کرنا چاہئے'' (قومی سوال پر تھیسس، 1913ء)۔ مزید برآں جیسا کہ ٹراٹسکی کی مندرجہ بالا تحریر میں نشاندہی کی گئی ہے کہ مارکسسٹوں کے نزدیک حق علیحدگی کو تسلیم کرنے کا مقصد علیحدگی کی وکالت بالکل نہیں ہے بلکہ قوموں کے درمیان یگانگت اور بھائی چارے کی فضا قائم کرنا ہے۔ لینن اس امر کی وضاحت کچھ یوں کرتا ہے، ''رجعتی لوگ طلاق کی آزادی کی مخالفت کرتے ہیں... اور باآوازِ بلند کہتے ہیں کہ اس کا 'مطلب خاندان کی ٹوٹ پھوٹ ہے۔' تاہم جمہوریت پسندوں کا کہنا ہے کہ یہ رجعتی لوگ منافق ہیں اور ایک جنس کی مراعات اور خواتین پر بدترین جبر کا تحفظ کر رہے ہیں۔ ان (جمہوریت پسندوں) کا خیال ہے کہ درحقیقت طلاق کی آزادی سے خاندانی رشتے 'ٹوٹ پھوٹ' کا شکار نہیں ہوں گے بلکہ الٹا جمہوری بنیادوں پر زیادہ مضبوط ہوں گے... اسی طرح حق خودارادیت یعنی حق علیحدگی کے حامیوں پر علیحدگی کی حوصلہ افزائی کا الزام لگانا بھی اتنا ہی احمقانہ اور منافقانہ ہے جتنا طلاق کی آزادی کے حامیوں پر خاندانی رشتوں کی تباہی کا الزام لگانا'' (قوموں کا حق خودارادیت، 1914ء)۔ استثنائی صورتوں سے ہٹ کے نہ تو مارکس اور اینگلز اور نہ ہی لینن اور ٹراٹسکی نئی قومی سرحدوں کی تشکیل اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں انسانوں کی تقسیم کو کوئی ترقی پسندانہ یا مثبت پیش رفت سمجھتے تھے۔ اس ضمن میں لینن کا دوٹوک موقف تھا کہ پرولتاریہ کی ہراول پرتوں کی ہمیشہ کوشش ہوگی کہ جمہوریت اور قومی مساوات کے اصولوں پر ہر ممکن حد تک وسیع ریاست تشکیل پائے اور ''ہم ہر قیمت پر چھوٹی قوموں کو برقرار رکھنے کے حق میں نہیں ہیں۔ وفاقی تعلقات کے پیٹی بورژوا خیال کے برعکس برابری کی بنیادوں پر ہم صریحاً مرکزیت کے حمایتی ہیں'' (عظیم روسیوں کا قومی غرور و تکبر، 1914ء)۔ بعد کے سالوں

میں اس نکتے کو لینن نے یوں آگے بڑھایا، ''ہم محکوم قوموں کے حق خودارادیت اور حق علیحدگی کا مطالبہ اس لئے نہیں کرتے کہ ہم ملک کی معاشی طور پر تقسیم کا خواب دیکھتے ہیں یا چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی تشکیل کے خواہاں ہیں۔ بلکہ اس کے برعکس کہ ہم بڑی ریاستیں اور قوموں کا قریبی اتحاد بلکہ ادغام چاہتے ہیں۔لیکن صرف حقیقی جمہوریت اور حقیقی بین الاقوامیت کی بنیاد پر، جو علیحدگی کی آزادی کے بغیر ناممکن ہے۔ جیسے مارکس نے 1869ء میں آئرلینڈ کی علیحدگی کا مطالبہ برطانیہ اور آئرلینڈ کے درمیان تقسیم کو ابھارنے کے لئے نہیں بلکہ بعد ازاں ان کے آزادانہ اتحاد کے لئے کیا تھا۔اس کا یہ مطالبہ 'آئرلینڈ کے لئے انصاف' سے زیادہ برطانوی پرولتاریہ کی انقلابی جدوجہد کے مفادات کو آگے بڑھانے کے لئے تھا...'' (انقلابی پرولتاریہ اور قوموں کا حق خودارادیت، 1915ء)۔ اور اس کے تقریباً ایک سال بعد: ''(حق خودارادیت کے) اس جمہوری سیاسی مطالبے کا مطلب علیحدگی کے حق میں ایجی ٹیشن کرنے کی آزادی اور علیحدگی کی خواہش رکھنے والی قوم میں ریفرنڈم کے ذریعے یہ مسئلہ حل کرنے کی آزادی ہے۔ نتیجتاً یہ مطالبہ کسی طور بھی علیحدگی، تقسیم اور چھوٹی ریاستوں کی تشکیل کا مطالبہ نہیں ہے... جوں جوں ریاست کا جمہوری نظام علیحدگی کی مکمل آزادی کے قریب آنے لگتا ہے' علیحدگی کی عملی کوشش اسی قدر نایاب اور کمزور ہونے لگتی ہے۔ کیونکہ نہ صرف معاشی ترقی بلکہ عوام کے مفادات کے نقطہ نظر سے بھی بڑی ریاستوں کے فائدے شک وشبہ سے بالا ہیں... خودارادیت کے حق کو تسلیم کرنے کا مطلب وفاق کو اصول بنانا نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک انسان اس اصول کا سخت مخالف اور جمہوری مرکزیت کا حامی ہو لیکن اس کے باوجود جمہوری مرکزیت تک کے واحد راستے کے طور پر فیڈریشن کو قومی نابرابری پہ فوقیت دے۔ بالکل یہی وجہ تھی کہ مارکس اگرچہ ایک مرکزیت پسند تھا لیکن اس نے آئرلینڈ کی برطانیہ کے ہاتھوں جبری محکومی پر آئرلینڈ کی برطانیہ کیساتھ فیڈریشن کو ترجیح دی'' (سوشلسٹ انقلاب اور قوموں کا حق خودارادیت، 1916ء)۔

ٹراٹسکی نے قومی سوال پر لینن کے اس بیش قیمت کام کو ''انسانیت کے خزانوں'' میں شمار کیا

ہے۔محکوم قوموں کی طرف لینن کی اس پالیسی نے نہ صرف بالشویک انقلاب بلکہ اس کے بعد چھڑ جانے والی انتہائی تباہ کن اور خونریز خانہ جنگی میں سرخ فوج کی فتح کو بھی یقینی بنایا۔ بالشویکوں نے اپنے عمل سے ثابت کیا کہ قومی حق خودارادیت ان کے لئے محض کھوکھلا نعرہ نہیں تھا۔اقتدار سنبھالنے کے بعد سوویت حکومت نے ایک ہفتے سے بھی کم وقت میں فن لینڈ کے حق آزادی کو تسلیم کیا۔جس کے بعد یوکرائن، مالڈووا، لیتھوینیا، اسٹونیا، بیلاروس، پولینڈ اور لیٹویا وغیرہ کی آزادی کی حمایت کی۔اگرچہ پہلی عالمی جنگ اور اس کے بعد سر پہ منڈلاتی خانہ جنگی کے حالات میں یہ انتہائی پیچیدہ اور کٹھن کام تھا۔لیکن انقلاب کی فتحیابی سے پہلے بھی بالشویک پارٹی کو قومی مسئلہ سے متعلق نظریاتی طور پر تیار کرنے کے لئے لینن کو سخت جدوجہد کرنا پڑی۔جیسا کہ ٹراٹسکی بیان کرتا ہے،''بالشویک پارٹی نے کسی طور بھی قومی سوال پر وہ موقف فروری انقلاب کے فوراً بعد نہیں اپنایا جسے لمبے عرصے میں اِس کی فتح کا ضامن بننا تھا۔ایسا نہ صرف کمزور اور ناتجربہ کار پارٹی تنظیموں والے سرحدی علاقوں بلکہ پیٹروگراڈ مرکز میں بھی تھا۔جنگ کے دوران پارٹی اِتنی کمزور ہوگئی تھی اور اِس کے کیڈروں کا نظریاتی اور سیاسی معیار اِتنا گر گیا تھا کہ لینن کی آمد تک اِس کے باضابطہ رہنماؤں نے قومی سوال پر بھی انتہائی متذبذب اور ادھورا موقف اپنایا'' (انقلابِ روس کی تاریخ)۔اس سے واضح ہوتا ہے کہ قومی مسئلے پر قوم پرستانہ و مصالحت پسندانہ خوش فہمیاں، تعصّبات اور تذبذب نہ صرف محنت کش طبقے بلکہ اپنے عہد کی انقلابی ترین پارٹیوں اور تنظیموں میں بھی سرایت کر سکتے ہیں جن کے خلاف مسلسل نظریاتی و سیاسی جدوجہد کی ضرورت ہمیشہ رہتی ہے۔جو لینن نے مرتے دم تک جاری رکھی۔مثلاً قومیتوں کے کمیسار کی حیثیت سے سٹالن نے جب یوکرائن، بیلاروس، جارجیا، آزربائیجان اور آرمینیا کی آزاد سوویت جمہوریاؤں کو روسی جمہوریہ میں خودمختیار علاقوں کی طور پر شامل کرنے کی تجویز پیش کی تو شدید علالت کے باوجود لینن نے سخت برہمی کا اظہار کرتے ہوئے سوویت یونین کو مساوی جمہوریاؤں کی فیڈریشن کے طور پر قائم کرنے پر اصرار کیا۔جس کے سامنے سٹالن کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔لیکن لمبے عرصے میں لینن کی قومی

پالیسی سٹالن اور سٹالنزم کے لئے ایک بند کتاب ہی رہی۔ نتیجتاً لینن کی وفات اور ٹراٹسکی کی بے دخلی و جلاوطنی کے بعد ردِ انقلابی سٹالنسٹ افسر شاہی نے سوویت یونین کے اندر اور باہر چھوٹی قوموں کی طرف روسی بالادستی اور جبر پر مبنی جو رویہ اپنایا اس کا مارکسزم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن قومی سوال پر لینن کا کام آج بھی اتنا ہی متعلقہ اور اہم ہے جتنا انقلابِ روس کے عہد میں تھا۔

آج اس خطے میں طبقاتی جبر و استحصال کی انتہا ہو چکی ہے تو قومی مسئلہ بھی پوری شدت سے سلگ رہا ہے۔ یہ سنگین قومی محرومی اور محکومی کے حقیقی جذبات ہی ہیں جو ملک کے طول و عرض میں نہ صرف قومی حقوق کی تحریکوں بلکہ علیحدگی کی امنگوں کو بھی جنم دیتے چلے آ رہے ہیں۔ حالیہ سالوں میں ان تحریکوں میں نئی قیادتیں سامنے آئی ہیں جو نوجوان بھی ہیں اور جن میں خواتین کی بھی کلیدی شمولیت ہے۔ ان میں خاصے ترقی پسندانہ رجحانات اور طبقاتی مطالبات بھی موجود ہیں۔ لیکن ساتھ ہی قوم پرستی سے جڑے ہر طرح کے رجعتی تعصّبات اور لبرل سرمایہ داری سے متعلق مضحکہ خیز خوش فہمیاں بھی نظر آتی ہیں۔ جس کی ایک وجہ طبقاتی کشمکش کی وقتی پسپائی اور محنت کش طبقے کا عدم تحرک بھی ہے۔ جس کے نتیجے میں پھر قومی مسئلے کو قوم پرستی کی نظر سے دیکھنے اور اقوام متحدہ جیسے دو غلے اور منافقانہ اداروں یا براہِ راست دوسری سامراجی طاقتوں سے آس لگانے کی روش عام ہو جاتی ہے۔ اس کے باوجود ان تحریکوں کو نہ دھتکارہ جا سکتا ہے، نہ نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ نہ ہی بلوچستان کی محرومی اور محکومی کو غیر مقامی مزدوروں کے قتل، جو یقیناً ایک انتہائی رجعتی اور قابل مذمت اقدام ہے، کے پیچھے چھپا کر ہاتھ جھاڑے جا سکتے ہیں۔ یہ ایک طرف انفرادی دہشت گردی کا ذمہ دار پوری قوم کو ٹھہرانے کے مترادف ہے۔ دوسری طرف یہ سوچ حاکم اور محکوم کو ایک سطح پر کھڑا کر کے ظلم و جبر کے طویل تاریخی پس منظر پر پردہ ڈالنے کا موجب بنتی ہے۔ جس کے نتیجے میں حالات کو اس نہج تک پہنچانے والی سامراجی طاقتیں بری الذمہ ہو جاتی ہیں۔ لیکن ساتھ ہی اس سے مسلح جدوجہد کے طریقہ کار کی محدودیت بھی واضح ہو جاتی ہے۔ خاص طور پر جب یہ طریقہ کار معروضی حالات سے ماورا، انقلابی نظریئے سے محروم اور وسیع تر محنت کش عوام سے جدا ہو

کر تنگ نظر قوم پرستی، جلد بازی اور مہم جوئی کے راستوں پر گامزن ہو جائے تو پوری تحریک کو بند گلی میں لے جاتا ہے۔ دوسری طرف اس نظام اور سٹیٹس کو پر یقین رکھنے والی سیاسی اشرافیہ کا ریاستی کاسہ لیسی اور گماشتگی پر مبنی کردار بھی کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ ان حالات میں انقلابیوں کا فریضہ ہے کہ لینن کے وضع کردہ لائحہ عمل کے مطابق قومی محکومی اور جبر کی ہر شکل کے خلاف اعلان جنگ کرتے ہوئے تمام قوموں کے محنت کشوں کو یکجا کرنے کی جدوجہد جاری رکھیں اور عبوری مطالبات کی مدد سے قومی سوال سمیت سماج میں سلگتے ہر بنیادی مسئلے کے حل کا انقلابی سوشلسٹ پروگرام وسیع تر عوام کے سامنے پیش کریں۔ اس عظیم تاریخی نصب العین کو عملی جامہ پہنانے کے لئے پھر ہر قومی وطبقاتی تحریک میں مداخلت لازم ہو جاتی ہے۔ جس کا مقصد قیادتوں کی خوشنودی کی بجائے تحریکوں میں شامل ہراول اور باشعور ترین عناصر کو اپنے پروگرام پر جیتنا ہی ہو سکتا ہے۔

آج پاکستان میں قومی مسئلہ جس قدر الجھا ہوا ہے اور مختلف قوموں کے افراد کی دوسرے خطوں میں جس بڑے پیمانے پر سکونت اور نقل مقانی کا رجحان موجود ہے اس کے پیش نظر یہ کہنا کوئی مبالغہ آرائی نہیں ہے کہ ایک رجعتی انداز میں قومی بنیادوں پر یہ معاشرے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتے ہیں تو جو بربادی ہو گی اس کے سامنے یوگوسلاویہ میں ہونے والے لسانی قتل عام بھی ماند پڑ جائیں گے۔ لیکن مارکسزم کے سائنسی نظریات پر یقین اور سوشلسٹ انقلاب کی جدوجہد کے ذریعے طبقاتی اور قومی جبر واستحصال پر مبنی اس پرانی اور تاریک دنیا کی جگہ ایک نئی دنیا تعمیر کی جا سکتی ہے۔ جو لینن کے الفاظ میں تمام قوموں کے محنت کشوں کے اتحاد پر مبنی ہو گی۔ ایک ایسی دنیا جس میں کسی خصوصی مراعت اور انسان کے ہاتھوں انسان پر جبر کی ذرہ برابر گنجائش نہیں ہو گی۔ ایک ایسی دنیا جس میں سارے جہاں کے محنت کش بلند تر تاریخی اور مادی بنیادوں پر ایک حقیقی انسانی اور بین الاقوامی ثقافت کی استواری کا عمل شروع کریں گے۔